اور اب دلوں ہی سے نہیں بلکہ آنکھوں سے بھی اس کی ساری خوبیاں اوجھل ہوتی جا رہی ہیں، جس طرح اس کے دوسرے گوشے مادی نظاموں کے گرد و غبار میں ڈھک گئے ہیں اسی طرح اس کے بین الاقوامی احکامات پر بھی دبیز پردہ پڑ گیا ہے، ضرورت تھی کہ اس موضوع پر اسلامی ہدایات کو سامنے لایا جاتا کہ آمادۂ جنگ دنیا کو امن و سکون کی کوئی کرن دکھائی دے سکے،

اس سلسلہ میں اردو میں بھی کچھ کام ہوا ہے، خود راقم نے بھی ۱۹۵۸ء میں اس موضوع پر ایک مضمون مسلم یونیورسٹی میں پڑھا تھا، مصر کے مشہور عالم اور مصنف شیخ ابوزہرہ نے عربی کا یہ رسالہ لکھ کر اسکے تمام گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، کتاب میں تین ابواب ہیں، انھوں نے پہلے باب میں اسلام کے بین الاقوامی تصورات کی اساس پر گفتگو کی ہے، مثلاً انسان کی عظمت، آدمیت وحدت کا تصور، انسانی ہمدردی، آزادی و انصاف، محبت و رفع فساد، عہد کی پابندی وغیرہ، دوسرے باب میں امن کے زمانہ میں ... اسلام کی بین الاقوامی ہدایات اور تیسرے باب میں زمانۂ جنگ میں اسلام کی ہدایات کی تفصیل کی ہے، شیخ ابوزہرہ جو کچھ لکھتے ہیں عالمانہ و محققانہ انداز میں لکھتے ہیں، چنانچہ اس کتاب میں بھی انھوں نے وہ انداز باقی رکھا ہے، امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے نہ صرف اسلام کا بین الاقوامی پہلو سامنے آجائے گا بلکہ اس سے بہت سی غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں گی،

موضح القرأت - از مولانا قاری محمد حبیب اللہ خان صاحب، صفحات ۱۰۰ سے زیادہ، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر قاری محمد عنایت اللہ مدرس تجوید القرآن، فاروقی مسجد حیدری دیڈ آاؤد کراچی ۳

اردو میں فن تجوید و قرأت پر متعدد رسالے شائع ہو چکے ہیں، ان میں یہ کتاب بھی ہے، اس میں تقریباً ۵۰ صفحات تک تجوید و قرأت کے عام قاعدے اور قراء سبعہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں، پھر پورے پارہ اول کو نقل کر کے اس کے اعراب اور رسم قرأت پر گفتگو کی گئی ہے، اور قرأت سبعہ کے تمام اختلافات کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ رسالہ بیحد مفید ہے،

"م، ج"

جلد ۹۶ ماہ جمادی الثانی ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۶۵ء عدد ۴

مضامین

شذرات

بالآخر مسلم یونیورسٹی کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا، نئے ایکٹ نے اس کی خودمختاری اور اس کی روح دونوں کا خاتمہ کر دیا، جب یونیورسٹی کی اگزیکیٹو کونسل اور کورٹ کے سارے ممبر حکومت کے نامزد کردہ ہوں وہ خودمختار کہلانے کی کہاں تک مستحق ہے، اس کی روح اور اس کا کردار اس طرح ختم ہوا کہ اکاون ممبروں میں گیارہ غیر مسلم ہیں، چالیس مسلمان ممبروں میں اکثریت وابستگان حکومت اور سیکلر مسلمانوں کی ہے، جن کو اسلامی کردار سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں اور اس کو وہ سیکلرزم کے خلاف سمجھتے ہیں، جن ممبروں کو حکومت سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے وہ بھی اس کے اثر سے آزاد نہیں ہیں، صرف چند ممبر مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں لیکن یونیورسٹی کی موجودہ فضا میں اس کی جرأت کون کرے گا اور اس کی آواز کا کیا اثر ہو سکتا ہے، ایسی حالت میں یونیورسٹی کے اسلامی کردار کے باقی رہنے کا کیا امکان رہ جاتا ہے، سیکلر مسلمانوں کو مبارک ہو کہ انھوں نے مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع کو سیکلر بنا کر چھوڑا، یہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایسا المیہ ہے جس کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

پرانے نیشلسٹ مسلمانوں کو اپنے مذہب و ملت اور اپنی تہذیب و روایات کا بھی لحاظ تھا، اس لیے اب وہ نئے ترقی پسند نیشلسٹوں کے مقابلہ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں، اور سیکلر مسلمانوں کا نیا طبقہ پیدا ہوگیا ہے جس نے پوری زندگی کو سیکلرزم کے دائرے میں داخل کر لیا ہے اور اپنی تہذیب و ثقافت کو بھی سیکلر بنانا چاہتا ہے، اور اس میدان میں ان میں مسابقت شروع ہوگئی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ سیکلرزم کی انتہا کہاں جا کر ہوتی ہے، اور اس میدان میں بازی کن خوش قسمتوں کے ہاتھ رہتی ہے، ہمارے خیال میں "سیکلر مسلمان" کی اصطلاح میں بھی فرقہ پروری کی بو آتی ہے، مسلمان کو بھی اڑا دینا چاہیے، تاکہ بغیر کسی آمیزش کے خالص سیکلرزم باقی رہ جائے۔

مسلم یونیورسٹی کی قلب ماہیت بھی انھی سیکلر مسلمانوں کا کارنامہ ہے، انھوں نے اپنے گمان میں مسلم یونیورسٹی کی روح ختم کر کے اپنی سیکلرزم کا ثبوت دیا ہے، اور ملک و قوم کی بڑی خدمت انجام دی ہے، لیکن حقیقۃً "ان دونوں کو نقصان پہنچایا ہے"، یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ چند نام نہاد مسلمانوں کے سوا پوری مسلمان قوم نے، آرڈیننس اور یونیورسٹی بل کی ایسی متفقہ مخالفت کی جس کی نظیر ہندوستان کی آزادی کے بعد نہیں ملتی، اور ان کو یونیورسٹی کی قلب ماہیت کا انتہائی دکھ ہے، اور اس کے اثر کو وہ اپنے دل سے کبھی نہیں مٹا سکتے، اس لیے ایسے حالات میں جب کہ ملک کے تمام فرقوں میں زیادہ سے زیادہ اتحاد و یکجہتی کی ضرورت ہے، اچھے کروڑ مسلمانوں کو حکومت سے بددل کرنا ملک کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے مخالفین سیکلر مسلمانوں نے جو کچھ کیا اس پر ہم کو تعجب نہیں ہے، ان کا تو کام ہی یہی ہے، البتہ شاستری جی کی خاموشی پر حیرت ہے، اتنا بڑا واقعہ ہوگیا مگر اس کے بارہ میں انھوں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا، وہ مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات سے پوری طرح واقف ہیں، بلکہ ہمارا حسن ظن تو یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ان کا نقطۂ نظر مسلمانوں کے جذبات سے زیادہ قریب ہوگا، انھوں نے ایسا ایکٹ کیوں بننے دیا، جو نہ صرف مسلمانوں کے جذبات

بلکہ حکومت کے مصالح کے بھی خلاف ہے، اگر پنڈت جواہر لال زندہ ہوتے تو مسلم یونیورسٹی کا یہ حشر نہ ہونے پاتا، اس لیے شاستری جی کو مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں بھی ان کی جانشینی کا حق ادا کرنا چاہیے، اسکی تلافی اب بھی ہو سکتی ہے آیندہ جو مستقل ایکٹ بننے والا ہے، اس کو جلد سے جلد بنایا جائے۔ اس میں کورٹ کو با اختیار ادارہ رکھا جائے، اس کے ممبروں کی تعداد بڑھائی جائے، ان کا انتخاب جمہوری طرز پر کیا جائے، مسلمانوں کی تمام اہم جماعتوں کو نمایندگی دیجائے تاکہ کورٹ میں ان کے اصلی نمایندے جاسکیں، جو حکومت کی نامزدگی کے ذریعہ ممبری قبول کرنا پسند نہ کرینگے، اس کے بغیر یونیورسٹی کا کردار اور اس کی خود مختاری قائم نہیں رہ سکتی۔

رام پور کا کتب خانہ مشرقی علوم خصوصاً عربی اور فارسی کے نادر مخطوطات کا مخزن ہے، اس کی عربی کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کی اردو فہرست عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے، اب اسکے لایق ناظم مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے کلام مجید، تفسیر، حدیث اور ان سے متعلقہ علوم کے عربی کے مخطوطات و نوادر کی فہرست اس کے جملہ لوازم کے ساتھ انگریزی میں مرتب کی ہے، جو تین جلدوں میں ہوگی، ابھی اس کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے، اس میں ۱۴۲۰ مخطوطات کا ذکر ہے، ان میں ۲۴۲ صرف کلام پاک کے نسخے اور بعض ایسے نوادر ہیں جو دوسرے کتب خانوں میں نہیں مل سکتے، فاضل مرتب کی دوسری کتابوں کی طرح یہ فہرست بھی انکی وسعت نظر، دقت نظر اور تلاش و تحقیق کا نمونہ ہے، عرشی صاحب نے یہ بڑی مفید علمی خدمت انجام دی ہے، اور یہ ان کا ایک علمی کارنامہ ہے، اس جلد کی قیمت تیس روپئے ہے، رضا لائبریری رام پور سے ملے گی۔

مقالات

امام ابن ماجہؒ اور ان کی سنن

خصوصیات کی ایک جھلک

از جناب مولوی تقی الدین صاحب ندوی مظاہری استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو

نام و نسب

سلسلۂ نسب یہ ہے: ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ الربعی بالولاء، القزوینی[1]، کنیت ابو عبد اللہ، نام محمد الربعی القزوینی نسبت اور ابن ماجہ عرف ہے، شاہ عبد العزیز صاحب نے ان کے دادا کا نام عبد اللہ لکھا ہے، ماجہ کے بارے میں اختلاف ہے، شاہ صاحب کے نزدیک یہ آپ کی والدہ کا نام ہے، فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ ماجہ آپ کی والدہ تھیں، اسلیے ابن میں الف لکھنا چاہیے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ابن ماجہ محمد کی صفت ہے، نہ کہ عبد اللہ کی،[2] مگر عجالۂ نافعہ میں شاہ صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ "ماجہ لقب پدر ابو عبد اللہ است ولقب جداو نہ نام مادر"[3] علامہ ابن کثیر نے حافظ خلیل قزوینی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ماجہ یزید کا لقب ہے[4]، چونکہ قبیلۂ ربیعہ سے ان کا رشتۂ موالات تھا، اس لیے ان کو ربعی اور مولیٰ ربیعہ کہا جاتا ہے، جس طرح امام بخاری کو جعفی کہا گیا ہے،

قزوینی قزوین کی طرف نسبت ہے جو ایران کا مشہور شہر ہے، اسی کو امام صاحب کے مولد و مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

پیدایش و ابتدائی حالات

امام ابن ماجہ ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے[5]، انھوں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں

[1] وفیات الاعیان ج ۳ ص ۳۰۸ [2] بستان ص ۱۱۲ [3] عجالۂ نافعہ ص ۲۸ [4] البدایۃ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲ [5] بستان ص ۱۱۲

اس وقت قزوین میں بڑے بڑے علماء مثلاً علی بن محمد ابو الحسن طنافسی م ۲۳۳ھ، عمرو بن رافع ابو حجر بجلی م ۲۳۷ھ، اسمٰعیل بن ابو سہل قزوینی م ۲۴۷ھ، ہارون بن موسیٰ تمیمی م ۲۴۸ھ، محمد بن ابی خالد ابو بکر قزوینی[1] وغیرہ مسند درس و افتاء پر جلوہ افروز تھے۔ امام صاحب نے پہلے ان سے استفادہ کیا، افسوس ہے کہ امام صاحب کی ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہ ہو سکے، بظاہر اسی عمر سے سماع حدیث کا آغاز کیا ہوگا۔

سماع حدیث کے لیے سفر قیاس ہے کہ امام صاحب نے ۲۳۰ھ کے بعد سفر کا آغاز کیا ہوگا، اس وقت عمر کا تیسواں سال تھا، یہ وہ زمانہ ہے کہ علم حدیث انتہائی عروج پر تھا، امام صاحب نے طلب حدیث میں مختلف شہروں کی خاک چھانی، مورخ ابن خلکان کا بیان ہے

ارتحل الی العراق والبصرۃ و الکوفۃ وبغداد ومکۃ والشام ومصر والری لکتب الحدیث[2]

حدیث کے لیے عراق، بصرہ، کوفہ، بغداد، مکہ، شام ومصر اور رے کا سفر کیا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

سمع بخراسان والعراق والحجاز ومصر والشام وغیرھا من البلاد[3]

خراسان، عراق، حجاز، مصر وشام اور دیگر بلاد میں سماع حدیث کیا،

وغیرھا من البلاد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ اور شہروں کا سفر بھی کیا تھا جس کا ثبوت ان کے شیوخ کے ناموں سے بھی ملتا ہے،

شیوخ و تلامذہ ان کے شیوخ کا استقصاء دشوار ہے، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب فرماتے ہیں، کہ جبارہ بن المغلس و ابراہیم بن المنذر و ابن نمیر و ہشام بن عمار اور اس طبقہ کے دوسرے حضرات سے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ [2] وفیات [3] تہذیب

علم حدیث حاصل کیا، خصوصیت سے ابو بکر بن شیبہ سے زیادہ استفادہ کیا[1]، ان کے شیوخ میں امام مالک اور لیث کے تلامذہ بھی ہیں[2]، ان کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے، علی بن سعید بن عبد اللہ العسکری، ابراہیم بن دینار الجرشی الہمدانی، احمد بن ابراہیم قزوینی جد ابو یعلی خلیلی، ابو طیب احمد بن روح شعرانی، اسحٰق بن محمد قزوینی، جعفر بن ادریس، حسین بن علی، سلیمان بن یزید قزوینی، محمد بن عیسیٰ صفار، ابو الحسن علی بن ابراہیم بن سلمہ قزوینی، ابو عمرو احمد بن مدنی اصبہانی وآخرون یعنی ان کے علاوہ اور بھی ہیں[3]،

علماء کا اعتراف کمال امام صاحب کے فضل و کمال اور جلالت شان، حفظ حدیث کا اعتراف ہر دور کے علماء و تذکرہ نویسوں نے کیا ہے، مورخ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ "کان اماماً فی الحدیث عارفاً بعلومہ وجمیع ما یتعلق[4]"۔ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: "ھو ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ صاحب کتاب السنن المشھورۃ وھی دالۃ علی عملہ وعلمہ وتبحرہ واطلاعہ واتباعہ للسنۃ فی الاصول والفروع[5]"۔ محدث ابو یعلی خلیلی کے الفاظ ہیں: "ابن ماجہ ثقۃ کبیر متفق علیہ محتج بہ لہ معرفۃ بالحدیث وحفظہ[6]"۔ علامہ ذہبی کی رائے ہے "قد کان ابن ماجہ حافظاً صدوقاً واسع العلم[7]"۔ حافظ ابن حجر نے "احد الائمہ حافظ" لکھا ہے[8]۔

مسلک امام صاحب کا مسلک متعین طور پر معلوم نہیں ہوتا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک امام احمد کے مسلک کی طرف میلان تھا[9]، مگر مولانا انور شاہ کی تحقیق ہے کہ شاید امام ابن ماجہ شافعی تھے[10]، علامہ طاہر جزائری فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ وغیرہ علماء و ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے مقلد نہیں تھے بلکہ ائمہ حدیث امام شافعی، احمد، اسحٰق اور ابو عبیدہ کے قول کی طرف میلان رکھتے تھے، یعنی اہل عراق کے مذہب کے مقابل میں اہل حجاز کی طرف زیادہ مائل تھے[11]، جس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے بھی ہوتا ہے

---

[1] بستان ص ۱۲۵ [2] مرقاۃ ج ۱ ص ۲۳ [3] تہذیب حوالہ مذکور [4] وفیات ج ۳ ص ۲۰۰ [5] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲ [6] تہذیب [7] سیر اعلام النبلاء [8] تقریب [9] الانصاف [10] معارف السنن ج ۱ ص ۲۲ [11] توجیہ النظر ص ۱۸۵

وفات | حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ میں نے قزوین میں امام ابن ماجہ کی تاریخ کا
نسخہ دیکھا تھا، جو عہد صحابہ سے لیکر ان کے زمانہ تک کے رجال اور امصار کے حالات پر مشتمل ہے، اس
تاریخ کے آخر میں امام صاحب کے شاگرد جعفر بن ادریس کی یہ تحریر ہے کہ ابو عبد اللہ محمد بن یزید نے دوشنبہ
کے دن انتقال فرمایا، اور سہ شنبہ ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۳ھ کو دفن کیے گئے، میں نے خود
ان سے سنا ہے، وہ فرماتے تھے کہ میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوا تھا۔ اس حساب سے وفات کے وقت
ان کی عمر ۶۴ سال کی تھی، ان کی وفات پر علماء نے مرثیے لکھے۔

تصنیفات | مورخین نے امام صاحب کی تین کتابوں کا ذکر کیا ہے، التفسیر والتاریخ والسنن۔
تفسیر کے متعلق علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں "لابن ماجہ تفسیر حافل"۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں
اس کو ابن جریر کے طرز کی تصنیف بتایا ہے۔ التاریخ، اس کو مورخ ابن خلکان نے
تاریخ ملیح اور حافظ ابن کثیر نے تاریخ کامل سے تعبیر کیا ہے۔

سنن ابن ماجہ اور اسکی خصوصیات | ان میں سنن ابن ماجہ سب سے اہم کتاب ہے، جس پر ہم آیندہ صفحات میں
تفصیل سے گفتگو کریں گے، اس کتاب کی افادیت و اہمیت پر علماء و محدثین کا اتفاق ہے، حافظ
ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں

وکتابہ فی السنن جامع جید[1] — انکی کتاب سنن (احکام) میں ایک عمدہ جامع ہے۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ کتاب نہایت مفید ہے اور مسائل فقہ کے لحاظ سے اسکی ترتیب
وتبویب ہے[2]، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے اس اجمال کی تفصیل فرمائی ہے:-

"وفی الواقع از حسن ترتیب وسرد احادیث بے تکرار واختصار آنچہ ایں کتاب دارد
ہیچ یک از کتب ندارد[3]"

---

۱ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ ۲ الباعث الحثیث ص ۹ ۳ بستان ص ۱۲۵

۲۔ اس کی "دوسری" نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بہت سی ایسی نادر حدیثوں پر مشتمل ہے جن سے
صحاح خمسہ خالی ہیں، علامہ ابو الحسن سندی فرماتے ہیں کہ مصنف نے بہت سے ابواب میں ایسی حدیثوں
کو نقل کیا ہے جو پانچوں مشہور کتابوں میں نہیں ہیں، اگرچہ وہ ضعاف ہیں، لیکن اسی مضمون کی دوسری
حدیثیں بھی ہیں جن کو دوسرے محدثین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

۳۔ مصنف نے مختلف شہروں کی مخصوص روایات کی نشاندہی بھی کی ہے، مثلاً "باب کل
مسکر حرام" کے تحت دو روایتوں کو نقل کیا ہے

(۱) حدثنا یونس بن عبد الاعلیٰ ثنا ابن وہب اخبرنا ابن جریج عن ایوب
بن ہانی عن مسروق عن ابن مسعود ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
قال کل مسکر حرام الخ اس کے بعد فرماتے ہیں "ھذا حدیث المصریین"
(یہ مصریوں کی حدیث ہے)

(۲) حدثنا علی بن میمون الرقی ثنا خالد بن حیان عن سلیمان بن عبد اللہ
بن الزبرقان عن یعلی بن شداد بن اوس سمعت معاویۃ یقول سمعت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول کل مسکر حرام، ھذا الحدیث الرقیین (یہ
رقہ والوں کی حدیث ہے)

۴۔ مختلف احادیث کے ذیل میں بعض ایسے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے
حدیث نبوی سے اس عہد کے مسلمانوں سے تعلق کا پتہ چلتا ہے، مثلاً باب ماجاء فیما یستحب من التطوع
بالنہار" کے تحت حبیب بن ثابت کی روایت نقل کی ہے، کہ انھوں نے اس حدیث کے راوی ابو اسحٰق
سبیعی کو مخاطب کرکے فرمایا "ما احب ان لی بحدیثک ھذا ملاء مسجدک ذھبا" مجھکو تم نے
جو حدیث سنائی اس کے بدلے میں تمہاری مسجد کے برابر بھرا ہوا سونا لینا بھی پسند نہیں کرتا۔

(۵) پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پانچ ثلاثی حدیثیں بھی ہیں، جب کہ امام مسلم و امام نسائی کی سب سے عالی روایات رباعیات ہیں جو سنن ابن ماجہ میں بکثرت موجود ہیں، البتہ صحیح بخاری میں ۲۲ اور سنن ابی داود و جامع ترمذی میں ایک ایک ہے۔

یہ پانچوں روایات ایک ہی سند سے مروی ہیں، اگرچہ امام ابن ماجہ کے طبقہ کے لحاظ سے بہت عالی ہیں، مگر سند کے اعتبار سے ان کا کوئی خاص وزن نہیں ہے، اس کے ایک راوی کثیر بن سلیم پر محدثین نے جرح کی ہے، وہ روایات حسب ذیل ہیں:

۱- حدثنا جبارة بن المغلس ثنا كثير بن سليم سمعت انس بن مالك يقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من احب ان يكثر الله خير بيته فليتوضا اذا حضر غداؤه واذا رفع. باب الوضوء عند الطعام

۲- حدثنا جبارة بن المغلس ثنا كثير بن سليم عن انس بن مالك قال ما رفع من بين يدي رسول الله صلى الله عليه وسلم فضل شواء قط ولا حملت معه طنفسة[1]

۳- حدثنا جبارة بن المغلس ثنا كثير بن سليم عن انس بن مالك قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الخير اسرع الى البيت الذي يغشى من الشفرة الى سنام البعير[2]

۴- حدثنا جبارة بن المغلس ثنا كثير بن سليم سمعت انس بن مالك يقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما مررت بليلة اسري بي بملأ الا قالوا يا محمد مر امتك بالحجامة[3]

۵- حدثنا جبارة بن المغلس ثنا كثير بن سليم عن انس بن مالك قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان هذه الامة مرحومة عذابها بايديها فاذا كان يوم القيامة دفع الى كل رجل من المسلمين رجل من المشركين فيقال هذا فداؤك من النار[4]

---

۱ باب الشواء ۲ باب الضیافت ۳ باب الحجامة ۴ باب صفة امة محمد صلی اللہ علیہ وسلم

سنن ابن ماجہ کے متعلق امام ابو زرعہ رازی کا ارشاد

عبد اللہ بن عبد الکریم بن یزید بن فروخ رازی المتوفی ۲۶۴ھ علم حدیث کے مشہور امام ہیں، جن کے متعلق امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ابو حاتم، ابو زرعہ، ابو داود یہ تین رے میں ایسے اشخاص ہیں جن کی نظیر اس وقت روئے زمین پر موجود نہیں[1]۔ علامہ ذہبی ابو زرعہ کے متعلق خود فرماتے ہیں "کان من افراد الدهر حفظا وذکاء ودینا وعلما وعملا"[2] یہ حفظ حدیث، ذکاوت، دینداری اور علم و عمل کے لحاظ سے ان لوگوں میں سے تھے جو یکتائے زمانہ ہوئے ہیں، انھوں نے سنن ابن ماجہ کو دیکھ کر یہ سند عطا فرمائی "اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تو فن حدیث کی اکثر جوامع اور مصنفات بیکار و معطل ہو کر رہ جائیں گی"[3]۔

حافظ ابو زرعہ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، آج ہمارے سامنے بہت سی حدیث کی کتابیں ہیں، جو صحت و قوت اسناد کے لحاظ سے اس سے کہیں فائق ہیں، مگر ان کو وہ قبولیت حاصل نہیں جو سنن ابن ماجہ کو ملی، مثلاً جیسے صحیح ابن حبان جس کے متعلق مورخ ابن العماد حنبلی نے تصریح کی ہے کہ "والاکثر انتقاد علی ان صحیحه اصح من سنن ابن ماجه"[4]

سنن ابن ماجہ کا صحاح ستہ میں شمار

حافظ ابن السکن نے اسلام کی بنیادی کتابیں چار بتائی ہیں، حافظ منده نے بھی مخرجین صحاح میں امام بخاری، امام مسلم، ابو داود اور امام نسائی ہی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے[5]، بعد میں ابو طاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی مذکورہ بالا چاروں کتابوں کے ساتھ شمار کیا اور فرمایا کہ ان پانچوں کتابوں پر علمائے مشرق و مغرب کا اتفاق ہے، شیخ ابن صلاح م ۶۴۳ھ اور علامہ نووی م ۶۷۶ھ تک نے ان ہی پانچ کتابوں کے مصنفین کی وفیات بیان کی ہیں[6]، ان دونوں بزرگوں نے امام ابن ماجہ کو نظر انداز کر دیا، اس لیے علامہ سیوطی نے علامہ نووی پر تدریب الراوی میں استدراک کیا ہے کہ "لم یدخل المصنف سنن ابن ماجه فی الاصول وقد اشتهر فی عصر المصنف وبعده جعل الاصول ستة بادخاله فیها"[7]

---

۱ تذکرہ ج ۲ ص ۔ ۲ ایضاً ۳ بستان ص ۱۲۲ ۴ شذرات ترجمہ ابن حبان ۵ شروط الائمہ ۶ مقدمہ ابن صلاح ص ۳۸۶ ۷ تدریب ص ۳۰

مصنف (علامہ نووی) نے سنن ابن ماجہ کو بنیادی کتابوں میں داخل نہیں کیا ہے، حالانکہ خود مصنف کے عہد میں اور ان کے بعد سنن ابن ماجہ کو چھ بنیادی کتابوں میں شمار مشہور ہو چکا تھا۔[1] سب سے پہلے حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی م ۵۰۷ھ ہیں جنھوں نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں داخل کیا، ان کے بعد تمام مصنفین نے ان کی پیروی کی ہے،[2] ان کے بعد حافظ عبدالغنی مقدسی م ۶۰۰ھ نے الاکمال فی اسماء الرجال میں ان چھ کتابوں کے رجال کو یکجا کیا،

اس کے بعد حافظ ابن طاہر کے معاصر محدث رزین م ۵۲۵ھ نے کتاب التجرید للصحاح والسنن میں کتب خمسہ کے ساتھ سنن ابن ماجہ کے بجائے موطا امام مالک کی حدیثوں کو درج کیا اور انہیں کی اقتداء علامہ ابن الاثیر جزری م ۶۰۶ھ نے جامع الاصول میں کی ہے، اس کے برخلاف علامہ ابوسعید خلیل بن کیکلدی العلائی م ۷۶۱ھ نے جو سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے سنن دارمی کو چھٹی کتاب قرار دیا ہے، شیخ محمد عابد سندی نے شیخ علائی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "انه قال لو قدم مسند الدارمی بدل ابن ماجه فکان سادساً کان اولیٰ"[3] یعنی اگر سنن ابن ماجہ کے بجائے سنن دارمی کو چھٹی کتاب قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب رہے گا، حافظ ابن حجر نے بھی شیخ علائی کی ہمنوائی کی، علامہ سیوطی لکھتے ہیں "قال شیخ الاسلام ولیس ای الدارمی دون السنن الاربعة فی الرتبة بل لو ضم الی الخمسة فکان اولیٰ من ابن ماجه فانه امثل منه بکثیر" شیخ الاسلام حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ دارمی کی کتاب رتبہ میں سنن اربعہ سے کم نہیں ہے، بلکہ اگر اس کو کتب خمسہ کے ساتھ ملا دیا جائے تو ابن ماجہ کی بہ نسبت یہ اولیٰ ہے، کیونکہ وہ سنن ابن ماجہ سے کہیں فائق ہے۔[4] محدث عبدالغنی نابلسی نے اپنی کتاب ذخائر المواریث فی الدلالة علی مواضع الاحادیث میں لکھتے ہیں کہ چھٹی کتاب کے متعلق اختلاف ہے، پس اہل مشرق کے

[1] تدریب ص ۵۳ طبع جدید [2] ایضاً ص ۵۴ [3] حطہ ص ۴۲ [4] تدریب

نزدیک ابوعبداللہ محمد بن ماجہ قزوینی کی کتاب کتاب السنن ہے اور اہل مغرب کے نزدیک امام مالک ابن انس کی موطا ہے۔

لیکن علامہ سندی کا فیصلہ ہے کہ عام طور پر علماء متاخرین سنن ابن ماجہ کو حدیث کی چھٹی کتاب مانتے ہیں،

یہ واضح رہے کہ جہاں تک قوت و صحت کا تعلق ہے، موطا کا مقام اس سے بہت بلند ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تو صحیحین پر اس کو ترجیح دی ہے، سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شمار کرنے کی وجہ اس کی افادیت ہے، اس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو موطا میں نہیں ہیں، علامہ سیوطی فرماتے ہیں: "در ج اهل العلم بالاثر والمتقدمون فیهم و کثیر من محققی المتاخرین ولماء أه بعضهم کتابا مفیدا اقوی النفع فی الفقه و ای من کثرة زوائده علی الموطا ادرجه علی وهنه علی الاصول"۔[1]

اسی طرح مسند دارمی کی اہمیت جو بھی ہو لیکن صحاح ستہ کی جگہ مدت ہوئی سنن ابن ماجہ لے چکی ہے، مؤرخ ابن خلکان ۶۸۱ھ امام ابن ماجہ کے ترجمے میں لکھتے ہیں وکتابه فی الحدیث احد الصحاح الستة" حدیث میں ان کی کتاب صحاح ستہ میں ایک ہے۔[2]

سنن ابن ماجہ کا صحاح ستہ میں مرتبہ | امام ابوالقاسم رافعی المتوفی ۶۲۳ھ فرماتے ہیں کہ حفاظ حدیث امام ابن ماجہ کی کتاب کو صحیحین یا سنن ابی داؤد و سنن نسائی کے برابر سمجھتے ہیں اور اس کی روایات سے سند لاتے ہیں۔[3] علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں "کلها جیاد سوی الیسیرة"[4] (سب حدیثیں اچھی ہیں سوائے چند کے) علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ سنن ابن ماجہ بہت اچھی کتاب ہے، کاش اس میں چند واہی حدیثیں نہ ہوتیں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے[5]

[1] انجاح الحاجہ حاشیہ کشف الاستار [2] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۵۴ [3] ما تمس بہ الحاجہ ص ۲۳۵ [4] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۶ [5] تذکرہ ج ۲ ص ۱۸۹

ابوزرعہ کا بیان ہے کہ میں نے ابوعبداللہ ابن ماجہ کی کتاب کا مطالعہ کیا، اس میں چند معمولی احادیث پر کلام ہے، جن کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوگی، باقی کتاب میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے
مگر علامہ ذہبی نے ابوزرعہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس میں شاید تیس حدیثیں ایسی ہوں جن کی اسناد میں ضعف ہے[۲]، اس طرح امام ابوزرعہ کے دو قول ہوگئے ایک دس کا دوسرا تیس کا،
ممکن ہے ان تیس حدیثوں سے مراد وہ حدیثیں ہوں جن کو علامہ ابن الجوزی نے کتاب الموضوعات میں داخل کیا ہے، جس پر "التعقبات علی الموضوعات" میں تفصیلی بحث ہے، علامہ سیوطی نے ابوعبد اللہ رشید کے واسطے سے یہ نقل کیا ہے کہ امام ابن ماجہ نے ایسے لوگوں کی حدیثوں کی تخریج کی ہے جو کذب سے متہم ہیں، ان کی بعض احادیث صرف ان ہی کے واسطے سے مروی ہیں، شارح ابن ماجہ اپنی شرح میں فرماتے ہیں وبالجملة فهو دون الكتب الخمسة فی المرتبة[۳]

| سنن ابن ماجہ کے متعلق ایک اہم غلط فہمی | سنن ابن ماجہ کی ان ضعیف روایتوں کی وجہ سے یہ کلیہ مشہور ہوگیا ہے کہ كل ما انفرد به ابن ماجه فهو ضعيف، حافظ ابن حجر نے بھی تصریح |

کی ہے فی السنن جامع جید کثیر الابواب والغرائب وفیہ احادیث ضعیفة جدا[۴]
مگر علامہ مزی نے کلیہ سے اتفاق نہیں کیا ہے "ولیس الامر فی ذلک علی اطلاقه باستقرائی وفی الجملة ففیه احادیث کثیرة منکرة" یعنی میرے استقراء کے مطابق یہ حکم علی الاطلاق نہیں لگایا جاسکتا ہے، اگرچہ فی الجملہ اس میں منکر احادیث کی تعداد زیادہ ہے، اور مزی کی تصریح کو رجال پر محمول کرنا اولیٰ ہے، حدیثوں پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے،[۵]
جن روایات میں ابن ماجہ منفرد ہیں ان میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور حسن بھی، مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کی تحقیق میں رجال کے متعلق بھی کلی طور پر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا، اور اپنی کتاب ابن ماجہ و

---

[۱] شروط الائمہ ص ۱۹، [۲] تذکرہ ص ۱۸۹/۲۵، [۳] الیانع الجنی ص ۵، [۴] تہذیب التہذیب [۵] ایضاً

علم حدیث میں اس کو مثالوں کے ذریعہ واضح فرمایا ہے،
ان وجوہ کی بنا پر ابن ماجہ کا مرتبہ سب سے آخیر میں رکھا گیا ہے، علامہ ابوالحسن سندی شارح ابن ماجہ اپنی شرح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں وبالجملة فهو دون الكتب الخمسة فی المرتبة۔

| تنبیہ | شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں "ودریں کتب آنچہ (ق) حدیث است |

از صحاح وحسان وضعاف ہمہ موجود است وتسمیہ آں بصحاح بطریق تغلیب است (ایضا) ان کتابوں (صحاح ستہ) کی جتنی حدیثیں موجود ہیں ان پر صحاح کا اطلاق تغلیبا کیا جاتا ہے۔
یہ واضح رہے کہ صحاح ستہ میں صحت کے لحاظ سے فرق مراتب مجموعی حیثیت سے قائم کیا گیا ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ صحاح خمسہ کی ہر حدیث سنن ابن ماجہ کی ہر روایت پر صحت میں فوقیت رکھتی ہے۔

| تعداد ابواب واحادیث | سنن ابن ماجہ میں بتیس کتابیں، پندرہ سو ابواب اور چار ہزار حدیثیں |

ہیں[۱]، جو چند کے سوا سب کی سب عمدہ ہیں،[۲]

| سلسلہ روایت | ابن ماجہ کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے، اور متعدد لوگوں نے اس کتاب کو |

امام صاحب سے روایت کیا ہے، لیکن سب سے زیادہ جس کی روایت کو حسن قبول حاصل ہوا، وہ شیخ ابوالحسن قطان ہیں، ان کے نسخے میں بہت سی روایتیں خود ان کی سند سے بھی منقول ہیں، مطبوعہ نسخوں میں قال ابوالحسن حدثنا سے یہی مراد ہیں، یہ اپنے زمانے کے بڑے عالم اور محدث تھے، ان کی ولادت ۲۵۴ھ اور وفات ۳۴۵ھ میں ہوئی، سنن ابن ماجہ کی اہمیت کی بنا پر مختلف زمانوں کے علماء نے اس کی جانب اعتنا کیا، اس کی شرحیں، حواشی اور دوسرے متعلقات پر کتابیں لکھیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے،

| شروح ومتعلقات | ۱۔ شرح ابن ماجہ: امام حافظ علاء الدین مغلطائی بن قلیچ بن عبداللہ الحنفی م ۷۶۲ھ |

---

[۱] تذکرہ ص ۱۸۹، [۲] بستان المحدثین ص ۲۵،

سب سے پہلی شرح ہے، جو جامعیت کے باوجود نامکمل رہ گئی، صرف ایک حصہ کی شرح پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ شرح ابن رجب حنبلی م ۷۹۵ھ

۳۔ ماتمس الیہ الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ، شیخ سراج الدین عمر بن علی الملقن م ۸۰۴ھ، یہ صرف زوائد یعنی ان روایات کی شرح ہے جو کتب خمسہ میں موجود نہیں ہیں۔

۴۔ الدیباجہ: شیخ کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری م ۸۰۸ھ، یہ شرح پانچ جلدوں میں ہے۔

۵۔ نور مصباح الزجاجہ: شیخ علی بن سلیمان مالکی مغربی، علامہ سیوطی کی شرح مصباح الزجاجہ شرح سنن ابن ماجہ کا اختصار کیا ہے، مصر میں طبع ہو چکی ہے۔

۶۔ شرح ابن ماجہ: ابو الحسن محمد بن عبد الہادی سندی حنفی المتوفی ۱۱۳۸ھ اس میں ضبط الفاظ حلِ غریب اور بیان اعراب پر زیادہ توجہ کی گئی ہے۔

۷۔ انجاح الحاجہ شرح سنن ابن ماجہ۔ شیخ عبد الغنی بن ابی سعید مجددی م ۱۲۹۵ھ، یہ ایک مختصر تعلیق ہے۔

۸۔ حاشیہ بر سنن ابن ماجہ، مولانا فخر الحسن گنگوہی، یہ مشہور و متداول حاشیہ ہے، اس میں علامہ سیوطی اور مولانا عبد الغنی مجددی دونوں کی شرحوں کو مع مزید اضافہ کے جمع کیا ہے۔

۹۔ مفتاح الحاجہ، شیخ محمد علی: یہ حاشیہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

۱۰۔ المجرد فی اسماء رجال ابن ماجہ کلہم سوی من اخرج منہم فی احد الصحیحین: امام ذہبی۔ اسکا قلمی نسخہ کتبخانہ ظاہریہ میں موجود ہے۔

۱۱۔ ماتمس بہ الحاجہ اور ابن ماجہ و علم حدیث۔ یہ دونوں کتابیں مولانا عبد الرشید صاحب نعمانی کی تصنیف ہیں، ان میں علم حدیث اور سنن ابن ماجہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے، حدیث کے طالبعلموں کے لیے انکا مطالعہ بہت مفید ہے۔

یہود کی تصویر قرآن و بائبل میں

از جناب مولوی حبیب صاحب ریحان ندوی استاد جامعہ اسلامیہ لیبیا

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب خلافت ختم ہو گئی اور اس سامراجی سازش کا انکشاف ہوا کہ ایک طرف اتحادیوں نے عربوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کی ایک متحدہ حکومت بنا دیں گے، دوسری طرف سری معاہدہ سائس پیکو" کی رو سے یہود سے یہ وعدہ کر لیا کہ ان کے لیے ارض فلسطین میں ایک یہودی وطن بنا دیں گے، اور یہ ہونا بھی تھا، کیونکہ "بحبل من الناس" لوگوں کے سہارے کے بغیر" اس کا قیام ممکن بھی نہ تھا، یہ کام جنگ عظیم میں ٹرکی کی شکست کے بعد ہی ممکن تھا، کیونکہ اس سے قبل سلطان عبد الحمید نے جس جرأت سے سامراجی طاقتوں سے فلسطین کو یہود کا وطن بنانے سے انکار کیا تھا، اس کے بعد اس کی توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ٹرکی کی خلافت کے جیتے جی یہ یہود کی آرزو پوری ہو سکتی ہے،

۱۹۱۷ء میں بالفور نے وعدہ کیا کہ وطن یہود کا قیام ہو کر رہے گا، عربوں نے اس کے خلاف احتجاج اور مظاہرے کیے، مگر جنگ کے بعد فلسطین پر برطانوی انتداب قائم ہو گیا اور یہود کے لیے جو آسانیاں بہم پہنچائی گئیں اور جس طرح ان پر ہجرت کے دروازے کھولے گئے، وہ سب کو معلوم ہیں، اور بالآخر وہ منحوس گھڑی آ گئی کہ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل نے اپنی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا، عرب ممالک متحدہ محاذ بنا کر لڑے مگر شکست کھائی، اس کے کئی اسباب تھے، جن کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں، بین الاقوامی طور پر جنگ بندی کے حدود قائم ہوئے، مگر اقوام متحدہ

کی قراردادوں تک کو اسرائیل نے بڑی حد تک ماننے سے انکار کر دیا، اور سامراجیوں کی امداد غضب، فریب اور انسانی لاشوں پر یہ نام نہاد حکومت قائم ہو کر رہی،

یہود کی دولت کی وجہ سے ان کا اثر بین الاقوامی سیاست پر بہت گہرا ہے، لیکن کسی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یہ اثر اتنا بڑھ جائے گا کہ یہود کی تمام تاریخی مخالفتوں، حضرت مسیحؑ کے انکار، ان کے ساتھ گستاخیوں اور مسیحیت کے متعلق یہود کے خیالات سے قطع نظر کر کے "نائب مسیح" پوپ مصلوبیت مسیح سے یہودیوں کی برأت کا وثیقہ نکال دینگے،

مسیحیت کو گرجا والوں نے عجائب و غرائب کا دین بنا دیا ہے، وحی الٰہی اور یہودیوں کی کتب مقدسہ کے مقابلہ میں مجمع مقدس ایجاد کیا گیا ہے، اس کا جو جی چاہتا ہے فتویٰ صادر کر دیتا ہے،

حضرت مسیحؑ کی وفات کے ۳۲۵ سال کے بعد آریوس کی وحدانیت کے جواب میں مسیح کی الوہیت کا فتویٰ دیدیا، ۳۸۱ء میں قسطنطنیہ کے مجمع اول نے روح القدس کی بھی الوہیت کا پروانہ نکال دیا، ۴۳۱ء میں مجمع افسس نے فتویٰ صادر کر دیا کہ مریمؑ نے اللہ پیدا کیا، جس کی دو طبیعتیں ہیں، لاہوتی و ناسوتی، قسطنطنیہ کے مجمع دوم نے ۶۸۰ء میں پاس کر دیا کہ دو طبیعتیں اور دو مشیتیں ہیں، ۸۹۶ء میں مجمع دوم نے اعلان کیا کہ روح القدس باپ اور ابن سے مشتق ہے، ۱۲۱۵ء میں گرجے کو مغفرت بانٹنے کا حق دیا گیا، اور ۱۸۶۹ء میں پوپ کی شخصیت کو بھی اسی طرح معصوم قرار دے دیا جس طرح انبیاء و رسل معصوم تھے، اس طرح حرام و حلال اور حق و ناحق کے سارے اختیارات پطرس کے خلیفہ پوپ کو مل گئے،

"جس کو وہ زمین پر باندھتے ہیں وہ آسمان پر بندھتا ہے" (متی ۱۶ : ۱۹)

ان عجائب نے اس دور ترقی میں گرجے پر جو مصیبتیں نازل کیں ان کو کنیسہ کی تاریخ کا ہر واقف کار جانتا ہے،

بہر حال پوپ کا یہ وثیقہ تاریخ اور منطق کی رو سے مسیحیت اور یہودیت کی دوستی اور تعلقات کی حیران کر دینے والی نشانی ہے، یہ وثیقہ پوپ نے اس وقت یہود کو بخشا جب وہ اورشلیم تشریف لے گئے، اور حکومت اسرائیل کی انتہائی کوشش کے باوجود یہود کے علماء نے پوپ کا استقبال تو الگ رہا ان سے ملاقات تک کرنا گوارا نہ کیا کیونکہ یہود مسیحیوں کو مرتد اور مشرک سمجھتے ہیں۔

بین الاقوامی خبر رساں ایجنسیاں چونکہ یہود کے قبضہ میں ہیں، اس لیے انھوں نے اس وثیقہ کا نام "یہود کو خون مسیح سے بری کرنے والا وثیقہ" رکھا حالانکہ یہ وثیقہ صرف یہود سے متعلق نہیں بلکہ دوسری اقوام پر بھی مشتمل ہے، اور وہ پوری قوم یہود کی برأت نہیں کرتا، بلکہ حضرت مسیحؑ کے عہد کے عوام کو بری کرتا ہے،

اس وثیقہ میں اس کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ یہود کو ایک خود مختار قوم ثابت کیا جائے اور ان پر جو ظلم و ستم ہوئے ان پر افسوس کا اظہار کیا جائے، اس وثیقہ پر تفصیلی بحث انشاء اللہ ہم آیندہ کسی مضمون میں کریں گے، اس مضمون میں صرف قرآن اور بائبل سے یہودی قوم کی زندگی پر مختصر تبصرہ مقصود ہے، جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ قوم یہود کیا تھی اور کیا ہے، اس سلسلہ میں ہم قرآن پاک کی آیات انہی جگہوں پر نقل کریں گے جہاں اس کی نظیر تورات و انجیل سے ملے گی،

حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام سرزمین عراق میں پیدا ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اپنی نگرانی اور رحمت کے زیر سایہ ان کی تربیت فرمائی تھی، اس لیے ان کے مومن قلب سے یہ صدا اٹھی

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ — میں نے اپنا منہ اسکی طرف کیا جس نے آسمان

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا — اور زمین بنائے، ایک طرف کا ہو کر

اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام ۸۰)

اور میں مشرکین میں سے نہیں،

یہ نامانوس آواز سنکر مشرکین ان سے بحث کرنے لگے، انھوں نے جواب دیا

اَتُحَاجُّوْنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ (انعام ۸۱) کیا تم مجھ سے اللہ پر جھگڑتے ہو اور اس نے مجھکو ہدایت دی

سفر تکوین میں ہے

" تو میں تجھکو عظیم امت بنا دوں گا، اور تجھے برکت دوں گا، اور تیرا نام بڑا کرونگا اور تو برکت بن جائے گا، اور تجھے برکت بھیجنے والوں کو برکت اور تجھے لعنت بھیجنے والوں کو لعنت دوں گا، اور تجھ سے زمین کے سارے قبائل برکت حاصل کرینگے۔" (۱۲: ۲-۳)

یہ وعدۂ الٰہی پورا ہوا، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں اسحاقؑ، یعقوبؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، الیاسؑ، اسماعیلؑ، یسعؑ، یونسؑ اور لوطؑ پیدا ہوئے۔ (انعام ۸۵ - ۸۹)

اور تورات کی یہ بشارت پوری ہوکر رہی،

" اور تیری نسل کو زمین کی مٹی کے برابر کردوں گا۔" (تکوین ۱۳ : ۱۶)

اسحاقؑ ابراہیمؑ کے بیٹے تھے، اور یعقوبؑ اسحاقؑ کے لخت جگر اور دونوں کو اللہ تعالے نے نبوت و حکمت سے نوازا تھا، اور یعقوبؑ نبی تھے اس لیے معصوم اور ہر قسم کے گناہ سے پاک تھے، لیکن یہود کی کتابوں میں ان کی جو تصویر ہے، اس کے اعتبار سے ان کی حکومت کی بنیاد ہی مکر و فریب پر پڑی ہے، تورات میں ہے:-

" جب اسحٰق بوڑھا ہوگیا اور اس کی آنکھیں بینائی سے عاجز ہوگئیں تو اس نے اپنے بڑے بیٹے "عیسو" کو بلایا اور اس سے کہا اے بیٹے، اس نے کہا میں یہ ہوں، تو اس نے

کہا میں بوڑھا ہوگیا اور اپنی موت کا دن مجھے نہیں معلوم، اس لیے اس وقت تو اپنا تیر و کمان لیکر جنگل میں نکل اور میرے لیے شکار کر، اور جو کھانا مجھے محبوب ہے وہ بنا، وہ میرے پاس لا تاکہ میں کھالوں، اور میرا دل موت سے پہلے تجھے برکت دیدے، رفقہ یہ باتیں سن رہی تھی، عیسو جنگل شکار کرنے گیا، رفقہ نے یعقوب سے گفتگو کی یہ کہتے ہوئے کہ میں نے تیرے باپ کو تیرے بھائی "عیسو" سے گفتگو کرتے سنا کہ میرے لیے شکار لا، اور کھانا بنا، تاکہ میں اسے کھا کر رب کے سامنے تجھے برکت دوں وفات سے پہلے، اس لیے اس وقت اے لڑکے میری بات سن جو میں تجھے حکم دیتی ہوں، بکریوں کے پاس جا اور میرے پاس دو چھوٹے بچے بھیڑ کے لے آ، میں تیرے باپ کا محبوب کھانا بنادوں تو تو اسے اپنے باپ کے پاس لے جا تاکہ اسے کھالے اور تجھے برکت دیدے، یعقوب نے رفقہ سے کہا، عیسو کے بال ہیں اور میں بلا بال کے ہوں، اگر باپ نے مجھے چھولیا تو میں ان کی نگاہوں میں مجرم بن جاؤں، اور اپنے لیے لعنت لے لوں، برکت کے بجائے، اس کی ماں نے کہا، تیری لعنت میرے اوپر ہے اے میرے بچے، میری بات سن، اور جاکر مجھے لادے، وہ گیا اور ماں کو لادیا، ماں نے باپ کا محبوب کھانا پکایا، اور رفقہ نے اپنے بڑے لڑکے عیسو کے فاخر کپڑے یعقوب کو پہنائے۔" (تکوین ۲۷: ۱-۱۵)

اس طریقے سے یعقوب نے (توراۃ کے بیان کے مطابق) باپ کی برکت حاصل کی، اور جب "عیسو" جنگل سے واپس آیا اور اس نے یہ سب سنا تو

" بڑی زور دار اور کڑوی چیخ سے رویا اور کہا اے باپ مجھے بھی برکت دیجئے تو اس نے کہا، تیرا بھائی مکر سے تیری برکت لے گیا۔" (تکوین ۲۷: ۳۴ - ۳۵)

غور کیجئے، کیا نبی کی یہ شان ہوسکتی ہے؟ اور کیا برکت دینے والا خدا بھی دھوکہ

کھا سکتا ہے؟ اور کیا برکت خدا کے پاس اتنی محدود ہے کہ وہ دوسرے بھائی کو نہیں دے سکتا، یہود کے مکر وفریب کا تقاضا یہی تھا کہ سیدھی بات کو اتنا الٹ دیں۔ یحرفون الکلم عن مواضعہ

یوسف علیہ السلام یعقوبؑ کے بیٹے تھے، انھوں نے خواب دیکھا (تکوین ۳۷: ۵-۱۰) (یوسف ۴) تو بھائیوں کو آتش حسد نے جلا دیا، انھوں نے ان کو دھوکہ سے لیجا کر کنویں ڈال دیا (یوسف ۱۵) اور وہاں سے نکلنے کے بعد دوبارہ فروخت بھی کر دیا (تکوین ۳۷: ۲۵) مصر پہنچنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو بڑا عروج حاصل ہوا، بنی اسرائیل بھی مصر میں بہت پھولے پھلے، اس لیے مصریوں کو ان کے غلبہ کا خوف ہو گیا، تو انھوں نے ان کا زور توڑنا شروع کیا اور ان کی حالت غلامی کی ہو گئی،

"یہ بنی اسرائیل کی قوم ہم سے زیادہ اور عظیم ہے، ہم یہ حیلہ کریں کہ یہ بڑھیں نہیں کہ جب جنگ ہو تو ہمارے دشمنوں سے مل جائیں، اور ہمارے خلاف جنگ کریں اور زمین چھوڑ کر چلے جائیں، تو ان پر سردار مقرر کیے، جو ان کو مسخر کریں اور محنت کے بھاری کام دے کہ ان کو ذلیل کریں۔" (خروج ۱: ۹-۱۱)

قرآن پاک کا بیان ہے:

یسومونکم سوء العذاب
یذبحون ابناءکم ویستحیون
نساءکم وفی ذلکم بلاء من
ربکم عظیم
(بقرہ - ۴۹)

چکھاتے تھے تم کو سخت عذاب، تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور زندہ رکھتے تھے تمھاری عورتوں کو اور اس میں بڑی آزمائش تھی تمھارے رب کی طرف سے۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کو غلامی سے چھڑانے کیلئے بھیجا۔

"رب نے کہا میں نے اپنی قوم کی ذلت مصر میں دیکھ لی، اور ان کی آواز ان کے مسخرین کے لیے سن لی، میں نے ان کے درد جان لیے، تو میں اترا ہوں تاکہ ان کو مصریوں کے ہاتھ سے بچاؤں، اور اس زمین سے نکال کر ایسی اچھی زمین میں لیجاؤں جہاں دودھ وشہد بہتا ہے (خروج ۳: ۷)

حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے کہا:

انی رسول رب العلمین حقیق
علی ان لا اقول علی اللہ الا
الحق قد جئتکم ببینۃ من
ربکم فارسل معی بنی اسرائیل
(اعراف - ۱۰۵)

میں رب العالمین کا رسول ہوں، قائم ہوں اس پر کہ نہ کہوں اللہ کی طرف سے مگر سچ، میں لایا ہوں تمھارے پاس نشانی تمھارے رب کی تو بھیج دے میرے ساتھ بنی اسرائیل کو۔

فرعون کو موسیٰؑ کی یہ بات بری معلوم ہوئی، اس نے بنی اسرائیل کے ساتھ اور سختی شروع کر دی، حضرت موسیٰؑ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا

استعینوا باللہ واصبروا ان
الارض للہ یورثھا من
یشاء من عبادہ (اعراف - ۱۲۸)

مدد مانگو اللہ سے اور صبر کرو، بیشک زمین اللہ کی ہے، وارث کرتا ہے اس کا جس کو چاہتا ہے۔

لیکن بنی اسرائیل سخت دل اور ناحساس شناس تھے، کہنے لگے

اوذینا من قبل ان تأتینا
ومن بعد ما جئتنا (مائدہ - ۱۲۹)

ہم کو تکلیف دی گئی قبل اس کے کہ تم آؤ اور تمھارے آنے کے بعد بھی۔

موسیٰؑ نے نرمی سے سمجھایا

عسیٰ ربکم ان یھلک عدوکم	قریب ہے تمھارا رب ہلاک کردے تمھارے دشمنوں
ویستخلفکم فی الارض فینظر	کو اور نائب کردے تم کو زمین میں تاکہ دیکھے
کیف تعملون (مائدہ)	تم کیسے عمل کرتے ہو۔

فرعون حضرت موسیٰؑ کے معجزات دیکھنے کے بعد بھی اپنی سرکشی پر قائم رہا، اس وقت آپ نے بددعا فرمائی

ربنا اطمس علی اموالھم واشدد	اے ہمارے پروردگار ان کے مال ومتاع
علی قلوبھم فلا یومنوا حتی یروا	کو ملیامیٹ کردے اور ان کے دلوں کو
العذاب الالیم (یونس - ۸۸)	سخت کردے کہ وہ دردناک عذاب دیکھے بغیر ایمان نہ لائیں۔

اور آدھی رات کو اپنی قوم کو ساتھ لیکر مصر سے چل کھڑے ہوئے، فرعون کو خبر ہوئی تو وہ غصہ سے آگ ہوگیا اور ان کے تعاقب کا حکم دیا، جب بنی اسرائیل نے فرعون کو قریب آتے دیکھا تو اپنی کج فطرت پر آگئے اور حضرت موسیٰؑ پر برہمی ظاہر کرنے لگے۔

"اے موسیٰ کیا مصر میں قبریں نہیں تھیں کہ اس صحرا میں لاکر ہمیں مارنا چاہا، ہم نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو تو ہم کو مصر سے نکال کر لایا، کیا یہ بات ہم نے نہیں کہی تھی کہ ہم سے باز رہ کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کیونکہ یہ بہتر ہے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں اس سے کہ صحرا میں مریں۔" (خروج ۱۴: ۱۱-۱۴)

موسیٰ علیہ السلام نے ان کا خوف کم کرنا چاہا اور فرمایا

"رب تمھاری طرف سے لڑے گا اور تم خاموش رہوگے۔" (خروج ۱۴: ۱۴)

قرآن پاک نے اس کی تعبیر ان بلیغ الفاظ میں فرمائی ہے:

فلما ترآء الجمعان قال اصحاب	اور جب مقابل ہوئیں دونوں جماعتیں
موسیٰ انا لمدرکون قال کلا	تو اصحاب موسیٰ نے کہا ہم تو پکڑے گئے،
ان معی ربی سیھدین (الشعراء ۶۱-۶۲)	موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں، رب میرا ساتھ ہے جو راہ بتائیگا۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے فرمایا

اضرب بعصاک البحر (شعراء ۶۳)	مار اپنے عصا سے دریا کو

حضرت موسیٰؑ نے عصا مارا، دریا پایاب ہوگیا اور بنو اسرائیل سلامتی اور امن کے ساتھ گزر گئے اور فرعون اور اس کا لشکر غرق ہوگیا،

وانجینا موسیٰ ومن معہ اجمعین	اور بچا دیا ہم نے موسیٰ کو اور جو اس کے
ثم اغرقنا الآخرین (شعراء ۶۶-۶۵)	ساتھ تھے سب کے سب، پھر غرق کردیا دوسروں کو۔

توراۃ میں ہے

"اپنا عصا اٹھا کر سمندر کے اوپر ہاتھ پھیلا اور اس کو پھاڑ، تو بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں خشکی پر چلیں گے۔" (تکوین: ۱۴-۱۶)

"موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر پر بڑھایا تو سمندر صبح کے آتے آتے اپنی ہمیشہ کی حالت پر لوٹ آیا، اور گویا مصری اس کی ملاقات کے لیے بھاگ رہے تھے، تو رب نے مصریوں کو وسط سمندر میں دھکیل دیا، ان میں سے ایک بھی نہ بچا۔" (تکوین ۱۴: ۲۷-۲۸)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر رحم فرمایا اور ان کو فرعون کی غلامی سے آزادی بخشی۔

واورثنا القوم الذین کانوا	اور وارث کیا ہم نے اس قوم کو جو کمزور
یستضعفون مشارق الارض	تھی زمین کے مشرق و مغرب کا جس میں

وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا (اعراف - ۱۳۷)

ہم نے برکت رکھی اور پورا ہوا نیکی کا وعدہ بنی اسرائیل پر ان کے صبر کی وجہ سے۔

ان انعامات الٰہیہ کا تقاضہ تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی تنظیم اور ان کا احترام کریں، لیکن ابھی تھوڑی مدت بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ وہ پانی نہ ملنے پر غصہ میں خدا اور موسیٰ علیہ السلام کو برا کہنے لگے اور موسیٰؑ سے یوں گویا ہوئے۔

"تم نے ہم کو مصر سے کیوں نکالا کہ ہم کو ہماری اولاد اور مویشی کو پیاس سے مارڈالا تو موسیٰ چلایا رب کی طرف کہتا ہوا، میں اس قوم کا کیا کروں ؟ تھوڑی دیر بعد یہ مجھے سنگسار کردے گی۔ (خروج ۱۷ : ۳ - ۵)

اللہ نے ان کے لیے حوریب کی چٹان سے پانی نکالا اور موسیٰ سے اس طرح کہا

"میں تیرے سامنے حوریب کی چٹان کے پاس کھڑا ہوتا ہوں تو چٹان کو مار تو اس میں سے قوم کے پینے کے لیے پانی نکل آئے گا" (خروج ۱۷ : ۶)

قرآن نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے،

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (البقرہ - ۶۰)

اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کیلیے تو ہم نے کہا اپنے عصا سے پتھر کو مار تو بہہ نکلے اس سے بارہ چشمے، ہر قوم نے جان لی اپنی گھاٹ، کھاؤ اور پیو اللہ کی روزی سے اور نہ پھرو زمین میں فساد مچاتے۔

بہرحال جب وہ خدا کی ناشکری اور اپنی کجی کا اظہار کرتے ہوئے صحرائے سینا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے پھر ان کو سمجھایا اور اپنی اطاعت پر مزید انعام کا وعدہ فرمایا

"اب اگر تم نے میری آواز سنی اور میرے عہد کی حفاظت کی تو تم تمام قوموں میں سے میرے لیے خاص ہو جاؤ گے، کیونکہ میرے پاس خاص زمین ہے، اور تم میرے لیے کاہنوں کی حکومت اور امت مقدسہ بن جاؤ گے۔" (خروج : ۱۹ : ۵ - ۶)

کلام مجید میں ہے

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ (بقرہ: ۸۳)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے

اور اس عہد و میثاق کی بدولت ساری امتوں پر ان کو فضیلت بخشی گئی،

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (بقرہ ۴۷ - ۱۲۲)

اے بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمت کو جو تم پر کی اور میں نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت دی تھی۔

اور موسیٰؑ نے ان کو وصایائے عشرہ دیں، ان وصایا کا نچوڑ اور لب لباب یہ وصیت تھی،

"میں تیرا رب ہوں، جس نے مصر کی غلامی کی زندگی سے تجھکو نکالا، تیرے لیے میرے سوا کوئی معبود نہ ہو، نہ تو اپنے لیے پتھر سے کاٹا ہوا بت بنا اور نہ کوئی تصویر جو آسمان میں ہو، اوپر یا زمین میں سے ہو، نیچے یا پانی میں سے ہو، زمین کے اندر، نہ تو ان کو سجدہ کر اور نہ ان کی عبادت کر۔ (خروج ۲۰ : ۲ - ۵)

لیکن بنی اسرائیل اس عہد پر قائم نہیں رہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں ان کی غیر حاضری کے ایام میں بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کردی،

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ
ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ
وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ (بقرہ - ۹۲)

موسیٰ تمھارے پاس نشانیاں لایا، پھر تم نے بچھڑا بنالیا اس کے پیچھے اور تم ظالم ہو۔

توریت میں ہے:

"رب نے موسیٰ سے کہا جا اتر (پہاڑ سے) کیونکہ تیری قوم جس کو میں نے مصر سے نکالا تھا۔ فاسد ہو چکی، بہت جلد گمراہ ہوگئی، اس راستہ سے جس کی میں نے اس کو وصیت کی تھی، انھوں نے اپنے لیے سونے کا بچھڑا بنالیا، اور اس کے لیے قربانی کی، اور کہا کہ یہ تیرا معبود ہے، اے اسرائیل جس نے جس نے تجھکو مصر کی سرزمین سے نکالا تھا۔" (خروج ۳۲ : ۷ - ۸)

جب اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو اس جرم اور بدعہدی کی سزا دینی چاہی تو "موسیٰ گڑگڑائے، رب الارباب کے سامنے اور کہا اے رب کیوں اپنی قوم پر تیرا غصہ گرم ہوتا ہے، وہ جن کو تو نے مصر کی سرزمین سے نکالا تھا عظیم قوت اور زبردست ہاتھ کے ذریعہ۔" (خروج ۳۲ : ۱۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس سفارش پر اللہ تعالیٰ نے ان کا قصور معاف کر دیا۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ بَعْدَ ذَٰلِكَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (بقرہ - ۵۲)

پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کر دیا کہ شاید تم شکر گزار ہو۔

لیکن وہ اپنی تندخوئی اور عناد کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ بلکہ اللہ تعالیٰ سے بھی ذرا سی بات پر برہم ہو جاتے تھے، جب وہ شہد اور دودھ والی سرزمین میں داخل ہونے کے لیے چلے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو کنعان کی سرزمین میں داخل ہونے کے لیے

آمادہ کیا اور خبریں لانے کے لیے جاسوس بھیجے، بعض جاسوسوں نے جھوٹی خبریں اڑا دیں اور بنی اسرائیل کو ان سے ڈرایا اور کہا یہ سرزمین دودھ و شہد بہاتی ہے، لیکن قلعوں سے بھری ہوئی ہے، وہاں کے لوگ دیو ہیں، بعض شاہدوں نے اطمینان دلایا اور کہا کہ ہم ضرور فتحیاب ہوں گے لیکن بنی اسرائیل کو اس کا یقین نہیں آیا، چنانچہ توراۃ میں ہے:

"پوری جماعت نے آواز اٹھائی، اور چیخی اور روئی رات کو اور موسیٰ و ہارون پر پوری جماعت بنی اسرائیل غصہ ہوئی اور دونوں سے کہا، کاش ہم مصر میں مرجاتے، یا اس صحراء میں، اور کیوں رب ہم کو یہاں لایا کہ اس زمین پر ہم تلوار سے کٹ کر گریں، ہماری عورتیں اور اولاد غنیمت بن جائیں، کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ مصر لوٹ چلیں۔" (عدد ۱۴ : ۱-۳)

موسیٰ علیہ السلام نے عاجز آکر خدا کو پکارا تو خدا نے بنی اسرائیل کی مسلسل سرتابی کی سزا میں دھمکی دی کہ:

"موسیٰ و ہارون سے رب نے کہا میں کب تک اس شریر اور تندسر جماعت کو معاف کرتا رہوں، میں نے بنی اسرائیل کا میرے بارے میں غصہ دیکھ لیا، کہہ دے ان کو زندہ میں رب کہتا ہوں کہ وہی کروں گا تمھارے ساتھ جیسا کہ تم نے میرے کان میں کہا، اس صحرا میں تمھارے جسم گریں گے تمام گنے ہوئے تم میں سے اپنی گنتی کے موافق ۲۰ سال اور اس سے زیادہ عمر والے جنھوں نے مجھ پر غصہ کیا۔" (عدد ۱۴ : ۲۶-۲۹)

قرآن پاک میں یہ واقعہ کسی قدر تفصیل سے بیان ہوا ہے،

يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ
الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا
عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ

اے قوم داخل ہو پاک زمین میں جو لکھ دی اللہ نے تمھارے لیے، اور الٹے پیٹھ پھیر کر مت جاؤ تو لوٹو تم نقصان میں، تو انھوں نے

قالوا یا موسیٰ ان فیہا قوما جبارین
وانا لن ندخلہا حتی یخرجوا
منہا فان یخرجوا منہا فانا داخلون قالوا
یا موسیٰ انا لن ندخلہا ابدا
ما داموا فیہا فاذہب انت
وربک فقاتلا انا ہٰہنا
قاعدون ......

کہا، اے موسیٰ، اس زمین میں زبردست قوم
ہے، اور ہم اس وقت تک داخل نہ
ہوں گے جب تک وہ نہ نکلیں، کہا اے
موسیٰ ہم اس میں ہرگز داخل نہ ہونگے
جب تک کہ وہ اس میں ہیں، تو جا اور
تیرا رب اور دونوں لڑو ہم یہاں
بیٹھے ہیں،

قال رب انی لا املک الا نفسی
واخی فافرق بیننا وبین القوم
الفاسقین، قال فانہا محرمۃ
علیہم اربعین سنۃ یتیہون
فی الارض فلا تاس علی
القوم الفاسقین (مائدہ - ۲۱:۲۶)

موسیٰ نے کہا اے اللہ میرے اختیار میں
صرف میری جان ہے اور میرا بھائی
تو تفریق کر دے ہم میں اور فاسق قوم میں
کہا وہ زمین ان پر حرام کر دی گئی،
چالیس برس سر مارتے پھریں گے زمین میں
افسوس نہ کرنا فاسق قوم پر۔

اس عذاب خداوندی سے گذرنے کے بعد جب بنی اسرائیل جبل ہود پہنچے تو پھر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ

"رب نے اس قوم پر جلانے والے سانپ بھیجے جس نے ان کو ڈسا تو بہت سی قوم اسرائیل کی مر گئی۔" (عدد ۲۱:۶)

اللہ تعالیٰ نے وصایا میں ان کو بتوں کی پرستش اور زنا (خروج ۲۰:۱۴) سے روکا تھا لیکن انھوں نے شطیم میں جاکر

"قوم نے مواب کی لڑکیوں کے ساتھ زناکاری شروع کر دی تو ان زانیات نے قوم کو

اپنے معبودوں کے لیے قربانی کرنے کو کہا، تو قوم نے کھایا اور ان کے معبودوں کو سجدے کیے اور اسرائیل بعل فغور سے متعلق ہو گیا، تو خدا کا غصہ اسرائیل پر گرم ہوا، اور موسیٰ نے اسرائیل کے قضاۃ سے کہا کہ ہر ایک اپنی قوم کو قتل کرے، جو بعل فغور سے متعلق ہو گئے تھے۔" (عدد ۲۵: ۱-۵)

اس کفر و نفاق اور ظلم و طغیان نے ان کے دل کو پتھر جیسا بنا دیا، اور وہ لعنت خداوندی کے مستحق ہو گئے،

ثم قست قلوبکم من بعد
ذالک فہی کالحجارۃ او اشد
قسوۃ (بقرہ - ۷۴)

پھر سخت ہو گئے تمہارے دل تو وہ پتھر
کی طرح ہو گئے۔ اس سے بھی سخت۔

فبما نقضہم میثاقہم لعنہم
وجعلنا قلوبہم قاسیۃ (مائدہ - ۱۳)

ان کے پیمان توڑنے کی وجہ سے ہم نے
ان پر لعنت کی اور ان کے دل سخت کر دیے۔

بائبل میں ہے

"ان کے چہرے سخت ہو گئے چٹان سے زیادہ (ارمیا ۵ : ۳)

اب ان کا تمرد اور ان کی سرکشی اتنی بڑھ گئی کہ انبیاء کو جھٹلانا اور قتل کرنا شروع کر دیا،

افکلما جاءکم رسول بما لا
تہوی انفسکم استکبرتم ففریقا کذبتم
وفریقا تقتلون (بقرہ - ۸۷)

کیا جب جب کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے
جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا تو تم نے تکبر کرنا شروع کر دیا
سو بعضوں کو تو تم نے جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو قتل ہی کر ڈالا

لم تقتلون انبیاء اللہ من قبل
ان کنتم مؤمنین (بقرہ - ۹۱)

...کیوں قتل کرتے تھے انبیاء کو اس سے قبل
اگر تم مومن تھے،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے ان اعمال قبیحہ پر ان الفاظ میں ملامت کی ہے:

"اے سانپو! اے افاعی کی اولاد! تم کیسے جہنم کے عذاب سے بچ سکتے ہو، اس لیے کہ میں تمھارے پاس اپنے انبیاء، حکماء اور کتب ارسال کرتا ہوں، ان میں سے بعض کو تم قتل کرتے ہو، بعض کو پھانسی دیتے ہو، بعض کو محفل میں کوڑے لگاتے ہو، اور ایک شہر سے دوسرے شہر پھراتے ہو، تاکہ تم پر ہر طاہر خون جو زمین پر بہایا گیا، ہابیل صدیق کے خون سے زکریا بن برخیا کے خون تک جس کو تم نے ہیکل اور مذبح کے درمیان قتل کیا تھا، آجائے۔" (انجیل متی ۲۳: ۳۳-۳۶) (لوقا ۱۱: ۴۷-۵۱)

انبیاء کا قتل ان کا مشغلہ بن گیا، اور ان کا شہر اورشلیم (بیت المقدس) انبیاء علیہم السلام کا مقتل بن گیا، اس لیے حضرت عیسیٰؑ نے اورشلیم کو یہ بد دعا دی۔

"اورشلیم اورشلیم انبیاء کے قاتل، رسولوں کو سنگسار کرنے والی کتنی دفعہ میں نے چاہا کہ تیری اولاد کو اس طرح جمع کرلوں جس طرح مرغی اپنے بچوں کو کرتی ہے اپنے پروں کے نیچے لیکن انھوں نے نہیں چاہا۔ لو یہ تمھارا گھر خراب ہونے جارہا ہے۔" (متی ۲۳: ۳۷-۳۸) (لوقا ۱۳: ۳۴-۳۵)

ان بد اعمالیوں کے بعد بھی بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے فرزند ہیں "نحن ابناء اللّٰہ واحباءہ" کیونکہ ہم ابراہیمؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ کی اولاد ہیں، اس لیے قرآن مجید نے اس کی تردید کی اور فرمایا:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا (آل عمران - ۶۷)	ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ حنیف و اطاعت گزار تھے۔

اور حضرت مسیحؑ نے زیادہ صراحت کے ساتھ ارشاد فرمایا:

"بہت سے مشرق و مغرب سے آئیں گے اور ابراہیم و اسحٰق و یعقوب کے ساتھ ملکوت آسمانی میں بیٹھیں گے لیکن ملکوت کے بیٹے تو وہ خارجی ظلمت میں پھینک دیے جائیں گے اس وقت رونا ہوگا۔ اور انسان کی آواز۔ (متی ۸: ۱۱-۱۲)

ان کو جو فضیلت بخشی گئی تھی وہ عہد الٰہی کی حفاظت سے مشروط تھی، جب انھوں نے میثاق کو توڑ دیا تو ان پر لعنت کی گئی (مائدہ - ۱۳) اور ان سے وہ عہد چھین کر اس امت کے حوالے کردیا گیا جو اس پر قیامت تک چلتی اور انسانیت کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ (آل عمران ۱۱۰)	تم بہترین امت ہو نکالی گئی ہو لوگوں کے لیے ان کو اچھائی کا حکم دو

اس کی خبر حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو بہت پہلے دیدی تھی۔

"کیا تم نے کتابوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ وہ پتھر جس کو عمارت بنانے والوں نے رفض کردیا تھا وہ زاویے کا سر ہوگیا، رب کی طرف سے یہ ہوا لیکن ہماری نگاہوں میں یہ عجیب بات ہے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ ملکوت الٰہی تم سے چھین لیا جائے گا، اور ایسی امت کو دیا جائے گا جو اس کے مطابق کام کرے۔" (متی ۲۱: ۴۲-۴۳)

انھوں نے مسیحؑ سے حجت کے انداز میں یہ کہا کہ ہم تو ابراہیمؑ کی اولاد ہیں، ہماری توہین کیسے کیجائے گی، حضرت مسیحؑ نے کہا

"اگر تم ابراہیم کی اولاد ہوتے تو ابراہیم جیسے عمل کرتے (یوحنا ۸: ۳۹)

قرآن مجید کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی اس درخواست پر کہ "ومن ذریتی" فرمایا تھا، کہ ان میں سے جو ظالم ہوں گے وہ میرا عہد نہیں پا سکتے (بقرہ ۱۲۴) کیونکہ ظلم کا تعلق شیطان سے ہے اور شیطان کی خطا معاف نہیں ہوسکتی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے

صاف صاف فرمادیا کہ

"تم ایک باپ سے جو ابلیس ہے، اور اپنے باپ کی شہوات کو پورا کرنا چاہتے ہو، وہ شروع سے قاتل تھا لوگوں کا، اور حق پر جم نہ سکا تھا، کیونکہ اس کے پاس حق نہیں۔" (یوحنا ۸ : ۴۴)

اللہ تعالیٰ نے قبول حق کے لیے ان کے دلوں پر مہر لگادی۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بقرۃ - ۷)

اللہ نے مہر لگادی ان کے دلوں اور کانوں پر اور نگاہوں پر پردہ ڈالدیا تھا۔

اور نبی اشعیاء کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی

"سنیں گے سننا اور سمجھیں گے نہیں، اور دیکھیں گے دیکھنا اور دیکھیں گے نہیں کیونکہ اس قوم کا دل موٹا ہو چکا ہے، اور کان جاری ہو چکے ہیں" (متی ۱۳ : ۱۳-۱۵)

تو اس لیے وہ اللہ کی رحمت سے دور ہوں گے۔ اور "یوم الدین" میں ظلمت خارجہ میں پھینک دیے جائیں گے۔" (متی ۸-۱۱)

اور اللہ ان سے کہے گا

میں نے تم کو کبھی نہیں جانا تھا، مجھ سے دور ہو جاؤ اے گناہ کے کرنے والو۔" (متی ۷: ۲۲)

اور وہ اپنی بد اعمالیوں کی سزا میں ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ قرار پائے اور ذلت ان کی قسمت میں لکھ دی گئی،

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ

ان پر ڈالدی گئی ذلت و مسکنت اور وہ اللہ کے غصہ کا شکار ہوئے

بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (بقرہ - ۶۱)

اس لیے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کو جھٹلاتے اور انبیاء کو بغیر حق کے قتل کرتے تھے یہ اس لیے کہ وہ عاصی تھے، اور زیادتی کرتے تھے

نبی ارمیا نے بنی اسرائیل کے حق میں دعا کرنا چاہی تو

"رب نے کہا کہ اس کے لیے بھلائی کی دعا نہ کرو کیونکہ جس وقت یہ چلاتے ہیں تو میں ان کی آواز نہیں سنتا، اور جب وقت قربانی کرتے ہیں تو میں ان کی قربانی قبول نہیں کرتا، بلکہ تلوار، بھوک اور وبا سے میں ان کو فنا کر دونگا۔" (ارمیاہ ۱۴: ۱۰-۱۳)

بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کے اتنے قصے قرآن اور بائبل میں موجود ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو پوری ایک کتاب بن جائے،

کتب مقدسہ کے اس سرسری مطالعہ سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہود کیا ہیں؟ اور تاریخ میں ان کا اخلاق اور کردار کیا رہا ہے،؟

(باقی)

مناقب الاصفیاء

از

یکے از خاکپائے فردوسیاں، بہار شریف، پٹنہ

مارچ ۱۹۶۵ء کے معارف میں مناقب الاصفیاء پر جناب سید شمیم احمد صاحب کا مضمون نظر سے گذرا، اس کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ مضمون مناقب الاصفیا کی تنقید ہے یا تنقیص یا تقریظ، یا مضمون نگار نے اپنے دل کے اندر کچھ چھپی ڈھکی باتوں کو تحقیق کے پردے میں ظاہر کرکے اپنے نفس کو مطمئن کر لیا ہے، معارف کے عام ناظرین اس کو ایک تحقیقی اور علمی مضمون سمجھے ہوں گے لیکن فردوسیہ سلسلہ کے معتقدین کو یہ مضمون بالکل پسند نہ آیا، اگر یہ مضمون معارف جیسے بلند رسالہ کے علاوہ کسی اور رسالہ میں شائع ہوتا تو اس کو نظر انداز کر دیا جاتا، لیکن معارف میں اس کی اشاعت سے ذیل کی سطریں قلم سے خود بخود نکل آئی ہیں۔

مضمون پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ فردوسیہ سلسلہ کے مشائخ پر مستند اور قدیم تذکرہ مناقب الاصفیاء کے جو مصنف حضرت مخدوم شاہ شعیب فردوسی سمجھے جاتے ہیں، وہ در اصل اس کے مصنف نہیں ہیں، یہ ثابت کرکے مضمون نگار نے اپنے کو موجودہ دور کے ان محققین کی صف میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے جو یہ ظاہر کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ملفوظاتِ خواجگانِ چشت میں انیس الارواح حضرت شیخ عثمان ہروانی، دلیل العارفین حضرت شیخ معین الدین چشتی، فوائد السالکین حضرت شیخ قطب الدین

بختیار کاکی، اسرار الاولیاء حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ، افضل الفوائد حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ الخ کے ملفوظات نہیں ہیں، بلکہ یہ سب کے سب جعلی اور فرضی ہیں، اور کچھ ایسے محققین بھی ہیں جو شیخ فرید الدین عطارؒ کی تذکرۃ الاولیاء کو ان کی تصنیف ماننے کے لیے تیار نہیں، محققین کے اسی قبیلہ میں زیر نظر مضمون نگار کا بھی اضافہ ہوا ہے، جنھوں نے مناقب الاصفیاء کو محض اپنے قیاسات کی بنا پر حضرت مخدوم شاہ شعیب فردوسیؒ کی تصنیف تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، اگر تحقیق کے پردے میں اسی قسم کی قیاس آرائیوں کی مہم جاری رہی تو پھر ہمارے اسلاف کی ساری کمائی ان ہی محققین کی غارتگری کے نذر ہو جائے گی۔

اگر مضمون نگار نے پوری وضاحت کے ساتھ ثابت کر دیا ہوتا کہ مناقب الاصفیاء حضرت مخدوم شاہ شعیب فردوسیؒ کی نہیں ہے، اور ان کے بجائے اصل مصنف کا نام لکھ دیتے تو اس کو تسلیم کرنے میں نہ صرف معارف کے ناظرین بلکہ فردوسیہ سلسلہ کے معتقدین کو بھی تامل نہ ہوتا، لیکن وہ لکھتے ہیں کہ

"بعض لوگوں کو شبہہ ہے کہ یہ کتاب مخدوم شاہ شعیبؒ کی تالیف ہے"۔

دیانتداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ "بعض لوگوں" کو لکھتے وقت ان کے نام بھی لکھ دیے جاتے، یا جس طرح مضمون نگار نے اپنے مضمون کے حاشیہ میں جا بجا حوالے دیکر اس کو بظاہر موقر بنانے کی کوشش کی ہے، اسی طرح ان کو ان ماخذوں کا بھی حوالہ دینا لازمی تھا، جہاں سے اس شبہہ کی سراغ رسانی کی ہے، لیکن "بعض لوگوں کو شبہہ ہے" لکھ کر کتاب اور کتاب کے مصنف سے سوء ظن پیدا کرنا علمی تحقیق کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے، مضمون نگار نے اپنی غلط تحقیق کو موثر بنانے کیلئے لکھا ہے:

"بعض وجوہ سے اس شبہہ کو تقویت ملتی ہے، مؤلف نے کہیں اپنا نام نہیں لکھا ہے، اور نہ کسی پرانی تصنیف سے کوئی ثبوت ملتا ہے، مخدوم الملک کے خاندانی حالات نہایت مختصر

اور غیر واضح ہیں، مناقب الاصفیا سے پتہ چلتا ہے کہ مولف کو مخدوم الملکؒ سے فیض اٹھانے
کا کبھی موقع نہیں ملا تھا، اور یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب شیخ حسن بلخی کی لطیف المعانی
مرتب ہو چکی تھی، جو مخدوم شعیب متوفی ۸۲۴ھ کے بعد کی کتاب ہے، مناقب الاصفیا سے
یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت حسین بلخی کے کسی مرید کی تالیف ہے...... اگر مخدوم شعیب کی تالیف
ہوتی تو شیخ حسین بلخی کے بجائے مخدوم الملکؒ کو بنیاد بنا کر تمام بزرگوں کا ذکر کیا جاتا، کیونکہ
حضرت شعیبؒ..... مخدوم الملکؒ کے بھائی اور ہم عصر ہونے کے علاوہ مرید بھی تھے،
اگر مناقب الاصفیا واقعی مخدوم شعیبؒ کی تالیف ہے تو وصال کا سال ۸۲۴ھ غلط
معلوم ہوتا ہے، اور یہ روایت محض افسانہ معلوم ہوتی ہے کہ مخدوم الملکؒ نے مولانا مظفر بلخی
کو وصیت کی تھی کہ برادرم شعیب کو میرا عمامہ و خرقہ بھجوا دینا۔ اس کے بجائے یہ تسلیم کرنا ہوگا
کہ مخدوم شعیبؒ کو ارادت شیخ بلخی سے اور خلافت و اجازت شیخ حسن بلخی سے حاصل تھی۔"

اس اقتباس کا ہر ٹکڑا گمراہ کن ہے جس سے محققانہ انداز کے بجائے بھٹکے ہوئے ذہن کی
غمازی ہوتی ہے، پہلا اعتراض یہ ہے کہ

"مؤلف نے کہیں اپنا نام نہیں لکھا ہے"

بزرگان دین کتابیں آج کل کے مصنفوں کی طرح نام و نمود کیلئے نہیں لکھا کرتے تھے مشائخ کرام تو اپنی
ذات پر گمنامی اور اخفاء کا پردہ ڈالنے ہی میں اپنی اخروی نجات سمجھتے تھے، اس لیے مناقب الاصفیا
کے مصنف نے اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں، اور یہ دلیل کہ اس میں حضرت
مخدوم شاہ شعیبؒ کا اسم گرامی نہیں، اس لیے یہ ان کی تصنیف نہیں، اسی وقت مؤثر ہو سکتی ہے
جب اس میں ان کے بجائے کسی اور کا نام ہوتا، اور پھر ارباب نظر کا تو یہ دعویٰ ہے کہ اس کے دیباچہ
میں حضرت شعیبؒ کی تصنیف ہونے کا ثبوت موجود ہے، مطبوعہ نسخہ کے ص ۲ پر ہے:

"ایں بیچارہ ہلاک وادی من تشعبت بہ الہموم بسعادت جمعیت ذکر ایشان راہ یابد"

"تشعبت" سے حضرت شعیب کے نام کا اشارہ بھی ہے اور فردوسی سلسلہ کی گمنامی، اخفاء
استتار کی روش اور مشرب حزن کی روایت کی پابندی بھی ہے، اس کی وضاحت مناقب شعیبؒ میں
بھی کر دی گئی ہے جس کا حوالہ مضمون نگار نے جابجا دیا ہے لیکن مناقب شعیبؒ میں جہاں
مناقب الاصفیا کے مصنف کے نام کی وضاحت کی گئی ہے وہاں مضمون نگار کی نظر نہیں گئی، اور اگر
گئی تو اس کو اپنے مطلب کے خلاف بات تصور کیا، اس لیے معارف کے ناظرین کو غلط فہمی میں ڈالنے
کی خاطر نظر انداز کر دیا، مناقب شعیبؒ میں حضرت شاہ رکن الدین کی ڈائری کا حسب ذیل اقتباس
درج ہے:

"حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے مناقب الاصفیا کے نام کے متعلق استفسار تھا کہ
کیونکر یہ سمجھا جائے کہ مناقب الاصفیا حضرت مخدوم شعیبؒ کی تصنیف ہے، آپ نے فرمایا کہ اگر غور سے
دیکھو گے تو معلوم ہو جائے گا، مقدمۂ کتاب کی عبارت سے نام ظاہر ہے، چنانچہ میں کتاب
مناقب الاصفیا لایا اور آپ نے یہ عبارت پڑھی

ایں بیچارہ ہلاک وادی من تشعبت بہ الہموم بسعادت جمعیت ذکر ایشاں راہ یابد"

فرمایا اس عبارت میں صیغہ "تشعبت" سے شعیب نام کا اشارہ ظاہر ہے، نیز گمنامی حزن جو خاص
روش مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، وہ بھی ظاہر کی گئی ہے،
ہموم ہم کی جمع ہے، بمعنی حزن، اس عبارت کا مطلب یہ ہو کہ یہ بیچارہ نام کے اظہار کی
پیچیدگی میں حزن کی وادی میں ہلاک ہے، اتنا بھی جو اظہار نام کا خیال ہوا، یہ بھی مشائخ
کی روش سے دوری ہے، اس لیے یہ غم کی بات ہے، لیکن انھیں مشائخ کرام کے ذکر کی سعادت
سے راہ پا جانے کا امیدوار ہے۔"

مضمون نگار کو اس وضاحت سے تسلی نہیں ہو سکتی ہے تو پھر اور دلائل پیش کرتا ہوں،
اور ابتک تمام ارباب نظر دیباچہ کے اسی ٹکڑہ کو سامنے رکھ مناقب الاصفیاء کو حضرت شعیبؒ ہی کی
تصنیف سمجھتے رہے ہیں، اسی لیے اس کے مطبوعہ نسخے کے ٹائیٹل پر "مصنفہ حضرت مخدوم شاہ شعیب
فردوسی قدس سرہ لکھا ہوا ہے، فردوسیہ سلسلہ کے تمام بزرگوں کو گذشتہ صدیوں میں بھی یقین کامل
رہا کہ یہ حضرت مخدوم شعیبؒ کی تصنیف ہے، عوام الناس میں اس کی شہرت اس کی طباعت
کے بعد ہی ہوئی، فردوسیہ سلسلہ کے معتقدوں کے یہاں اس کے قدیم نسخے موجود ہیں اور وہ
اس کو حضرت شعیبؒ ہی کی تصنیف سمجھکر حرز جان بنائے ہوئے ہیں، ہندوستان کے
مشہور لکھنے والوں میں ابتک سیرۃ الشرف، وسیلۃ الشرف، بزم صوفیہ، تاریخ دعوت وعزیمت
کے مصنفین مناقب الاصفیاء کو حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ ہی کی تصنیف سمجھ کر اپنی اپنی
قابل قدر تصانیف میں اس کے حوالے دیتے رہے، اور ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات
نہ گئی کہ یہ حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کی تصنیف نہیں ہے، موجودہ دور میں تحقیق کا ایک رنگ
یہ بھی ہے کہ ایک مصنف یا مقالہ نگار، دعویٰ کرتا ہے کہ یہ اس کی کتاب یا اس کا مضمون ہے،
لیکن بعض محققین اس کی زندگی ہی میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اس کی کتاب
یا اس کا مضمون نہیں ہو سکتا، مثلاً مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا کہ الہلال میں بعض
مضامین ان کے ہیں لیکن بعض محققوں نے یہ ثابت کرنے میں آسمان و زمین کے قلابے ملادیے
کہ یہ ان کے نہیں ہیں،

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

معترض کو حضرت شعیبؒ کے مصنف ہونے میں شبہہ اس لیے بھی ہے کہ

"نہ کسی پرانی تصنیف سے ثبوت ملتا ہے۔"

کسی پرانی تصنیف سے ثبوت نہ ملنا حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کے مصنف نہ ہونے کی
دلیل نہیں ہو سکتی ہے، یہ اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جبکہ مناقب الاصفیا کے فوراً ہی بعد فردوسیہ
سلسلہ کے بزرگوں پر کوئی کتاب لکھی گئی ہوتی، تین چار سو سال پہلے کوئی ایسی تصنیف نہیں ہوئی
اور جب موجودہ دور میں جس کسی نے فردوسیہ سلسلہ کے بزرگوں کے حالات لکھے، اس نے مناقب الاصفیا
کا حوالہ حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ ہی کی تصنیف سمجھکر دیا،

ہمارے مقالہ نگار کو مناقب الاصفیا کو حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کی تصنیف سمجھنے میں ایسے
بھی تامل ہے کہ اس میں

"مخدوم الملک کے خاندانی حالات نہایت مختصر اور غیر واضح ہیں"،

یہ اعتراض محض طفلانہ ہے، کیونکہ اس کتاب میں تمام تفصیلات کا لکھنا پیش نظر ہی نہ تھا،
اور مقالہ نگار کو جن ظاہری احوال کی تلاش ہے، اس سے کہیں زیادہ حضرت مصنف کی نظر میں
ان مناقب کی اہمیت تھی جو قلمبند کی گئی ہے، احوالِ زندگی کے اختصار کے متعلق کتاب کے مقدمہ میں
یہ کہا گیا ہے کہ خداوند قدوس کے ان محبوب صدیقوں نے اپنے رب کی محبت کا معاملہ پردۂ توحید
میں رکھا ہے، اور غیرت الٰہی کا منشا یہ ہے کہ یہ نازنینانِ توحید اپنے خلوت کدۂ راز و نیاز سے
بے بہرہ نہ ہونے پائیں تاکہ اغیار کی نظر نحوست اثر ان کے سامنے نہ آئے، مقدمہ کی اصل عبارت یہ ہے:

"چوں صدیقان خداوند تعالیٰ را در قبۂ خلوت و پردۂ وحدت پرسیدہ و سلطان
غیرت الٰہی ان نازنینان حضرت را در سراپردہ تواری پنہاں داشتہ تا از نظر اغیار
مستور مانند" (ص ۳)

پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ ہر ایک بزرگ کا ذکر اور ان کے شجرۂ طیبہ کا تذکرہ طوالت سے
خالی نہیں، اگر تفصیل کے ساتھ لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے۔

"ذکر ہر ایک بزرگوار و اسناد جملہ بدیں شجرہ طیبہ اطالتے دارد کہ بشرح مجلد گردد۔" (ص)

اس معذرت کے بعد مضمون نگار کا یہ ظاہر کرنا کہ حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ اس کے مصنف ہوتے تو حضرت مخدوم الملکؒ کے خاندان کے حالات غیر واضح نہ ہوتے، محض ناظرین کو اپنی ذہنی سے بدظن کرنا ہے، اس کے علاوہ حضرت مخدوم جہاںؒ کے حالات زندگی میں جو ایجاز و اختصار ہے وہ دوسرے کے اطناب و تفصیل پر حاوی ہے، اگر بدگمانی کی عینک اتار کر اس کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں وہ سب کچھ ہے جو ہونا چاہیے، البتہ موجودہ مقالہ نگار کی طرح خواہ مخواہ کی طوالت نہیں ہے۔ معترض کا بیان ہے کہ

"مناقب الاصفیا سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف کو مخدوم الملک سے فیض اٹھانے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔"

معلوم نہیں مضمون نگار مناقب الاصفیا کی کس عبارت سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں؟ شاید یہ لکھ کر مضمون نگار نے اپنے ناظرین کو مغالطہ میں ڈال دینے کی کوشش کی ہے، اور وہ اس طرح کہ چونکہ مناقب اصفیا کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف کو مخدوم الملکؒ سے فیض اٹھانے کا کبھی موقع نہیں ملا، اس لیے مولف حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ نہیں ہو سکتے ہیں، جو حضرت مخدوم الملکؒ کے رشتہ دار اور ہمعصر ہونے کے علاوہ مرید بھی تھے، اور اگر حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ اسکے مؤلف ہیں تو ان کو حضرت مخدوم الملکؒ سے فیض اٹھانے کا موقع نہیں ملا، یہ دلیل مغالطہ آمیز ہے، حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ حضرت مخدوم الملکؒ سے فیض برابر اٹھاتے رہے، کیونکہ خود مضمون نگار کو تسلیم ہے کہ وہ حضرت مخدوم الملکؒ کے رشتہ دار، ہم عصر اور مرید تھے۔ مولانا آمون حضرت مخدوم الملکؒ کے پرانے با عظمت خلیفہ تھے، ان کا ذکر حضرت مخدوم الملکؒ کے ملفوظات میں بکثرت آتا ہے، مولانا کے ملفوظات رسالہ تحقیقات المعانی میں (جس کا ملفوظ مبارک بھی نام ہے) ہے

"اکثر اوقات گذرد و اتفاق تشریف آوری قدوۃ الواصلین زبدۃ العارفین حضرت مخدوم جہاں دام شرفہ بدیار محرم اسرار غیب مخدوم شاہ شعیب و بندگی شاہ اسحاق مغزی بدین نواحی می افتاد (ملفوظ مبارک مولانا آمون مجلس دوم)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مخدوم الملکؒ کی ملاقات حضرت شیخ شعیبؒ سے برابر ہوتی رہی، اور پھر جتنی تفصیلات حضرت مخدوم الملکؒ سے متعلق مناقب الاصفیا میں درج ہیں، وہ کسی اور تذکرہ میں نہیں، اور بعد میں ان ہی تفصیلات سے حضرت مخدوم الملکؒ کے حالات زندگی مرتب ہوتے رہے، اور ان حالات کے بین السطور میں جو والہانہ کیفیات ہیں، ان کو اہل نظر ہی سمجھ سکتے ہیں۔

ان کیفیات کو مضمون نگار نے محسوس نہیں کیا، اسی لیے وہ لکھ گئے ہیں کہ مناقب الاصفیا سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف کو حضرت مخدوم الملکؒ سے فیض اٹھانے کا موقع نہیں ملا، ان کو یہ پتہ اس وقت چلتا جب حضرت مخدوم شاہ شعیب حضرت مخدوم الملک سے اپنی ذاتی وابستگی اور قلبی شیفتگی کا اظہار جا بجا کھلے الفاظ میں کرتے، یہ نہیں کیا تو یہ ان کی خاکسارانہ عظمت کی دلیل ہے، جس کی قدر نہ کرکے مضمون نگار نے دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے،

معترض کا کہنا ہے

"یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب شیخ حسن بلخی کی لطیف المعانی مرتب ہو چکی جو مخدوم شعیب متوفی ۸۰۰ھ کے بعد کی کتاب ہے۔"

معترض کے سامنے مناقب شعیبؒ بھی جس کا حوالہ انھوں نے اپنے مضمون میں دیا ہے، پھر تعجب ہے کہ انھوں نے حضرت مخدوم شعیبؒ کا سنہ وصال ۸۰۰ھ کیسے لکھ دیا ہے، حضرت مخدوم شعیبؒ کے مزار مبارک کے سنگی کتبہ پر لکھا ہوا ہے:۔

وصال محرم اسرار غیب مخدوم شاہ شعیب قدس سرہ ۸۲۴ھ"

پھر مناقب شعیب میں ہے

مادہ سنہ وصال محرم حق شعیب ولی ۸۲۴ھ

مادہ سنہ وصال جس میں پانچ (۵) کا تخرجہ ہے

قلب مہر از جہاں بجنت شد

معترض کا یہ لکھنا کہ مناقب الاصفیا اس وقت لکھی گئی جب شیخ حسن بلخی کی لطیف المعانی مرتب ہو چکی تھی، معلوم نہیں یہ اعتراض ہے یا ایک امر واقعہ کا اظہار ہے حضرت شیخ حسن کے صاحبزادے مخدوم احمد لنگر دریا بلخی اپنے ملفوظات مونس القلوب کی اڑتالیسویں مجلس میں اپنی پیدائش کا سال ۸۲۶ھ لکھا ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کے آخری زمانہ میں حضرت شیخ حسن پورے بالغ اور صاحب اولاد ہو چکے تھے، اس لیے صاحب تصنیف ہونے اور لطیف المعانی کے تصنیف کرنے میں کیا قباحت پیدا ہوتی ہے، اور پھر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ چونکہ لطیف المعانی کے بعد مناقب الاصفیا لکھی گئی اس لیے حضرت شیخ شعیبؒ اس کے مصنف نہیں ہو سکتے ہیں

مضمون نگار کا دعویٰ ہے کہ

"مناقب الاصفیا سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت حسین بلخی کے کسی مرید کی تالیف ہے"

مضمون نگار کا یہ بھی بیان ہے کہ

"مخدوم شعیب کو ارادت شیخ حسین بلخی سے اور خلافت و اجازت شیخ حسن بلخی سے حاصل تھی"

اس طرح اگر کتاب کے آغاز میں حسب ذیل عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرت شیخ حسین بلخی کے کسی مرید کی تالیف ہے تو پھر حضرت شیخ مخدوم شاہ شعیبؒ نے اس کتاب کے مصنف ہو

کی سعادت سے کیسے محروم کیے جا سکتے ہیں، جب کہ وہ حضرت حسین بلخیؒ کے مرید تسلیم کرلیے جاتے ہیں،

"امابعد چوں شجرہ پیران بندگی مخدوم شیخ الاسلام والمسلمین برہان الحق والحقیقت والدین شیخ حسین معز شمس بلخی متع اللہ المومنین بطول بقائہ وادام علیہم نعمۃ بقایہ کہ سبب دلیل ہدایت مرید الست ....

اس عبارت سے جو یہ ظاہر ہے کہ یہ کتاب حضرت شیخ حسین کے مرید نے لکھی، اس کو تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں، لیکن اس سے حضرت شعیب مرید شیخ حسین کے مصنف ہونے میں کہاں سے نقیض پیدا ہوتا ہے؟

مضمون نگار لکھتے ہیں :

"اگر مخدوم شعیب کی تالیف ہوتی تو شیخ حسین بلخی کے بجائے مخدوم الملک کو بنیاد بنا کر تمام بزرگوں کا ذکر کیا جاتا، کیونکہ حضرت شعیب مخدوم الملک کے بھائی اور ہمعصر ہونے کے علاوہ مرید بھی تھے۔"

معلوم نہیں مضمون نگار نے یہ بات کیسے لکھدی، اس میں حضرت شیخ حسین کے مناقب تو لکھے بھی نہیں گئے، ان کو بنیاد بنانا کیا معنی؟ اور خود مؤلف کا بیان ہے کہ اس کتاب کا آغاز حضرت شرف الدین قدس سرہ اور شیخ مظفرؒ کے بیان سے ہونا چاہئے تھا، مگر ذکر رسالت کا ادب مانع ہوا، اس لیے ان بزرگوں کے تذکرہ میں پہل کرنے کی جرأت نہ ہو سکی وہ یہ بھی لکھتے ہیں، پیغمبر علیہ السلام کے ظاہری احوال میں بزرگوں نے بہت کچھ لکھا ہے، ان کے نقل و ترجمہ سے نجات کا وسیلہ ہے، اس لیے پہلے حضرت رسول اللہؐ پھر اہل بیت، پھر مشائخ کا بیان ہوگا، تاکہ ان خیر الوسائل کی پناہ میں تمام بزرگوں کے تذکرے آسان ہو جائیں اور ذکر پاک حضرت مخدوم مرحوم اور شمع جاں (یعنی حضرت مظفر) کا ذکر پاک بھی ان اذکار کے واسطہ سے منظور ہو جائے، فارسی کی اصل عبارت یہ ہے:

"مولف بیچارہ را براتباع سنن این شجرہ مبارک بذکر مرحوم شیخ مظفر و شیخ جہاں شرف الحق والدین قدس اللہ سرہما ہم بدایت می بایست کرد، اما تحریر مناقب و آثار ایشان اول جرأت نمودن نتوانست و زہرہ نہ داشت کہ ابتدا بذکر، احوال پاک ایشان سخن تواند پرداخت، و در احوال ظاہر پیغمبر علیہ السلام بزرگان سخن بسیار گفتہ کتابہا ساختہ بودند نقل و ترجمہ آنرا وسیلہ ساختہ بذکر مصطفےٰ و اہل بیت و مناقب سلف مشائخ بدایت کردہ تا در پناہ این خیر الوسائل جملہ اذکار آسان شود و ذکر پاک مخدوم مرحوم و شیخ جہاں ہم بر سنن اذکار ایشان منظور گردد۔"

مضمون نگار لکھتے ہیں:

"یہ روایت محض افسانہ معلوم ہوتی ہے کہ مخدوم الملک نے مولانا مظفر بلخی کو وصیت کی تھی کہ برادرم شعیب کو میرا عمامہ و خرقہ بھجوا دینا، اس کے بجائے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مخدوم شعیب کو ارادت شیخ حسین بلخی سے اور خلافت و اجازت شیخ حسن بلخی سے حاصل تھی۔"

مضمون نگار یہ تسلیم کرانا چاہتے ہیں کہ حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کو ارادت شیخ حسین بلخی سے تھی، گویا وہ کسی اور کے مرید نہ تھے، لیکن وہ خود لکھتے ہیں کہ حضرت شعیبؒ مخدوم الملکؒ کے بھائی اور ہم عصر ہونے کے علاوہ مرید بھی تھے۔ ان کی تحریر میں جو ژولیدگی ہے، اس سے وہ خود شاید بے خبر ہیں، یہ تسلیم کرانے کی ضرورت نہیں کہ حضرت مخدوم شاہ شعیب صرف شیخ حسین بلخی کے مرید تھے، وہ حضرت مخدوم الملک اور حضرت شیخ حسین بلخی دونوں کے مرید تھے، اور پھر خلافت و اجازت شیخ حسن سے بھی ملی، ایک شیخ کو مختلف واسطوں سے ارادت کا حاصل ہونا اور سند خلافت کا ملنا کوئی انوکھی بات نہیں، یہ طریقہ ہمیشہ سے رائج رہا ہے جو مناقب الاصفیا کے دیباچہ سے بھی ظاہر ہے؛

"بدانکہ سند صحبت و خرقہ مشائخ رضوان اللہ علیہم طرق بسیار در بسیار پیوستہ و اسناد شجرہائے مشائخ کرام بمناہج مختلفہ بحضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم می رسد۔" (ص ۴)

اس وضاحت کے بعد یہ لکھنا کہ مناقب الاصفیا اگر حضرت مخدوم شاہ شعیب کی تالیف ہوتی تو شیخ حسین بلخی کے بجائے مخدوم الملکؒ کو بنیاد بنا کر تمام بزرگوں کا ذکر کیا جاتا، کہاں تک صحیح ہے، خود ناظرین فیصلہ کریں، مضمون نگار نے اس کتاب کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا تو ان کو پتہ چلتا کہ اس میں حضرت مخدوم الملکؒ کے حالات ۲۱ صفحے میں درج ہیں، اتنے صفحے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے بعد کسی اور بزرگ کے مناقب میں نہیں لکھے گئے، یہ گویا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت مخدوم الملکؒ ہی کو بنیاد بنا کر تمام بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے، حضرت مخدوم الملکؒ کے بعد حضرت شاہ مظفر شمس بلخی کے حالات ہیں، جن کو قلمبند کرنے کے بعد کتاب ختم کر دی گئی ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کتاب لکھنے کا مقصد فردوسی سلسلہ کے بزرگوں کے حالات پیش کرنا تھا، اس میں مخدوم حسین نوشہ توحید اور مخدوم حسن کے حالات نہیں ہیں، حالانکہ حضرت مخدوم شاہ شعیب کو ارادت مخدوم حسین سے تھی اور خلافت مخدوم حسن سے ملی تھی، ان دونوں بزرگوں کے حالات نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مؤلف نے جب یہ کتاب لکھی تو دونوں بزرگ بقید حیات تھے، اس لیے ان کے بزرگوں کے حالات لکھنے ہی پر مؤلف نے اکتفا کیا، اور خود مضمون نگار نے تسلیم کیا ہے کہ مناقب الاصفیا فردوسیہ سلسلہ کے بزرگ خصوصاً مخدوم الملک اور مولانا مظفر بلخی کے حالات میں ایک مستند و قدیم ترین تذکرہ ہے، اس کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ یہ کتاب مخدوم الملکؒ کو بنیاد بنا کر نہیں لکھی گئی،

اسی طرح حضرت مخدوم شاہ شعیب کو مخدوم الملکؒ کا عمامہ و خرقہ بھجوانے کی روایت کو محض افسانہ سمجھنا بھی ایک عجیب بات ہے، اگر اس روایت کی تردید مؤثر دلائل سے کی جاتی تو اور بات تھی، مگر اس کو محض ایک جنبش قلم سے افسانہ قرار دیکر لوگوں کو

اس کو تسلیم نہ کرنے پر آمادہ کرنا تحقیقی چیرہ دستی ہے، اگر یہ روایت محض افسانہ ہے تو ہندوستان کے تمام صوفیۂ کرام کے حالات میں اس قسم کی جو روایتیں ملیں گی وہ بھی مضمون نگار کی نظر میں افسانے ہوں گے، اور پھر ان روایتوں کو افسانہ سمجھنے والوں کو کوئی حق نہیں ہے کہ ان بزرگوں کے حالات کا مطالعہ کریں، ان کو پہلے ادب شناس ہونا چاہیے تب وہ کوئی تحریری گلفشانی کر کے علم و ادب کی خدمت کی جرأت کریں، مذکورۂ بالا روایت حضرت مخدوم شعیب کے حالاتِ زندگی کا ایک ضروری جزء ہے جس کو حضرت مخدوم شاہ شعیب کے تمام معتقدین صحیح سمجھتے ہیں، اور تذکرہ نویس بھی اس کو بیان کرتے رہے ہیں، مثلاً حضرت جلال الدین شطاری نے ۱۲۷۹ھ میں تذکرہ شعیب لکھی تو اس میں اس روایت کی پوری تفصیل لکھی ہے جس کا ایک ٹکڑا ہدیۂ ناظرین ہے، مخدوم حسین نے حضرت مخدوم الملکؒ کے تبرکات کو اپنے صاحبزادے مخدوم حسن کے حوالہ کیا، اور کہا کہ تم مخدوم شعیبؒ کے پاس پہنچا آؤ، اس ٹکڑے کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو،

"مجھے اس وقت معذوری ہے، میں نہیں جا سکتا، آپ جائیں اور حضرت مخدوم شیخ شعیب کی امانت ان تک پہنچا آئیں، اس بنا پر یہ غریب حضرت کی زیارت کا احرام باندھکر روانہ ہوا، یہ بہت بہتر ہوا کہ حضرت یہاں تشریف لے آئے ہیں، چنانچہ خرقہ، عمامہ، بیٹی اور قینچی کو حضرت مخدوم شیخ شعیب کی خدمت میں پیش کیا، حضرت مخدوم شیخ شعیب بصد ادب و تعظیم و اعتقاد سروقد کھڑے ہو گئے، ان کو سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا اور چند بار بوسہ دیا، اپنی مخصوص کسر نفسی کی بنا پر بے انتہا عذر خواہی کی اُس بندہ کی کیا قدرت و لیاقت ہو کہ وہ اپنے پیر شرف العالمین کا خرقہ پہنے، لیکن جب آقا کا حکم اور نوازش یہی ہے تو کیا مجال کہ عذر کرے، لیکن جس طرح حضرت مخدوم جہاں نے باطناً اس حقیر کو ارادت، خلافت اور اجازت سے مشرف فرمایا ہے، حضرت بھی ظاہراً اس خرقہ و دستار کو بطریق خلافت و

اجازت اپنی جانب سے عنایت فرمائیں، حضرت مخدوم شیخ حسن حضرت مخدوم شعیب سے حضرت مخدوم جہاں کے بھائی ہونے کی وجہ سے بڑا اعتقاد رکھتے تھے، اس لیے تواضع اور اعتقاد کی بنا پر معذرت کر کے کہا کہ آپ پیر دستگیر حضرت مخدوم شرف العالمین کی جگہ پر ہیں، میری کیا قدرت ہے کہ آپ کے سامنے خلافت پیش کروں، حضرت مخدوم شعیب نے فرمایا کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں میری کیا مجال کہ میں بھی کہوں کہ ایسا ہی ہے، آپ خلافت و اجازت میں تربیت اور وصیت کے مطابق حضرت مخدوم جہاں کی جگہ پر ہیں، اگر اپنی طرف سے بھی خلافت و اجازت عطا فرمائیں تو میں حضرت مخدوم شرف العالمین کے خرقہ معظمہ سے مشرف ہوں، جب شیخ الاسلام شیخ حسن نے حضرت مخدوم شیخ شعیب کا اصرار بہت دیکھا تو الامر فوق الادب (تعمیل حکم ادب پر مقدم ہے) کہتے ہوئے اپنی خلافت و اجازت سے مشرف فرمایا، پھر یہیں سے حضرت شیخ حسن بہار کی جانب روانہ ہوئے اور حضرت مخدوم شعیب شیخپورہ کی طرف تشریف لے گئے، اس طور پر یہ تین واسطے حضرت مخدوم جہاں پناہ تک پہنچے ہیں"۔

اس روایت میں کون ایسی افسانویت ہے جس کو قبول کرنے سے انکار ہے، تمام سلاسل کے بزرگوں کے حالاتِ زندگی میں ایسی روایتیں بھری پڑی ہیں جن کو رد کرنا اپنی طبیعت کا خاص رنگ ظاہر کرنا ہے، اسی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ شعیب کو شیخ حسن سے خلافت و اجازت ملی جس کو مضمون نگار نے بھی تسلیم کیا ہے، اگر مذکورۂ بالا روایت رد کر دی جاتی ہے تو شیخ حسن سے خلافت و اجازت کے ملنے کا ماخذ بھی ختم ہو جاتا ہے، اور یہ کسی حال میں بھی کہنا صحیح نہیں کہ یہ خلافت و اجازت نہیں ملی،

ایک جگہ مناقب الاصفیا پر اعتراض کرتے ہوئے مضمون نگار لکھتے ہیں

"مناقب الاصفیا میں سید السادات ظہیر کو مرحوم لکھا ہے، حضرت سید ظہیر کے نام مولانا مظفر بلخی کے خطوط ملتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نویں صدی ہجری میں مرتب کی گئی"۔

مضمون نگار نے یہ بات عدم واقفیت کی بنا پر لکھی ہے، مولانا مظفر بلخی کے خطوط سید السادات ظہیر کے بجائے مولانا ظہیر الدین کے نام ہیں، مونس القلوب (ملفوظ مخدوم احمد لنگر دریا بلخیؒ) کی مجلس سوم میں سید ظہیر الدین کا ذکر پہلے تو اس طرح آیا ہے

"ہم در اثنائے این ذکر سید ظہیر الدین کہ مشرف بوقت اندافتاد"

پھر مجلس پنجاہ و دوم میں ہے

"حاضرے عرض داشت خدمت امیر سید ظہیر الدین کہ بود؟ فرمود ہم چنیں شنیدہ شدہ است، ابو مسلمہ نام مردے از مریدان بندگی شیخ تقی الدین رحمۃ اللہ علیہ بندگی امیر را ارادت بردہ بود (الی آخرہ)

اس سے ظاہر ہے کہ امیر سید ظہیر الدین کوئی اور بزرگ ہیں، جن کا ذکر مناقب الاصفیا میں ہے، مولانا مظفر بلخیؒ کا مکتوب اول اور مکتوب ۶۹ مولانا ظہیر الدین کے نام ہیں، جو امیر سید ظہیر الدین سے مختلف ہیں، اس وضاحت کے بعد مضمون نگار کو اپنی رائے بدلنی ہوگی، اور جب حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کے وصال کی تاریخ ۸۲۴ھ ہے تو پھر یہ لکھ کر کوئی نکتہ پیدا کرنا فضول ہے، کہ یہ کتاب نویں صدی ہجری میں لکھی گئی۔

ان باتوں کے علاوہ مضمون نگار نے اپنے مضمون میں کچھ ایسی باتیں بھی لکھی ہیں جن کے لکھنے کا مقصد صاف نہیں، مثلاً مناقب الاصفیا کے مطبوعہ اور قلمی نسخہ میں فرق صرف یہ دکھایا ہے کہ ایک قلمی نسخہ میں ہے کہ سنار گاؤں میں حضرت مخدوم الملکؒ کو ایک مرض ہوگیا تھا جس کے دفع کیلئے ایک جاریہ رکھی، لیکن مطبوعہ نسخہ میں ہے کہ اس مرض کے دفع کیلئے نکاح کیا، مضمون نگار کو قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں صرف یہی ایک فرق نظر آیا جسکو انھوں نے اپنی تحقیق سے ناظرین کے سامنے پیش کیا، بزرگان دین کے حالات لکھنے میں اگر کسر نفسی کے بجائے بدنفسی یا اخلاص کے بجائے بدنیتی ہو تو پھر اس راہ میں قدم رکھنا انتہائی سوء ادب ہے، ہر طرح کی

چھان بین کے بعد "نکاح کرد" ہی مستند سمجھا گیا، اسی لیے مناقب الاصفیا کے مطبوعہ نسخہ میں بھی یہ لکھا گیا، پھر اس کو تسلیم نہ کر کے فرق کو ظاہر کرنا محض چاند پر خاک ڈالنے کی سعی لاحاصل کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

مضمون نگار کو اعتراف ہے کہ مناقب الاصفیا ایک مستند اور قدیم ترین تذکرہ ہے اور جہاں تک واقعات اور ان سے متعلق تاریخ وصال کا تعلق ہے، مؤلف نے احتیاط سے کام لینے کی کوشش کی ہے، لیکن وہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ

"مولف نے اپنے خانوادہ کے پیروں کے ساتھ مبالغہ کی حد تک عقیدت کا اظہار کیا ہے"۔

معلوم نہیں مضمون نگار کا مطلب مبالغہ سے کیا ہے، پیروں کے ساتھ انتہائی عقیدت کا اظہار کرنا آداب سلوک میں داخل ہے، خود مناقب الاصفیا کے مؤلف نے دیباچہ میں فرمایا ہے،

"روش ظاہر بزرگان ایشان آنست کہ پیر را خلیفۃ اللہ و قائم مقام رسول اللہ تصور کنند و حسن آدابے کہ مر نبی را باید کہ دمرا و را بجا آرند"

ہر مسلمان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جملہ انبیاء و رسل پر فضیلت دیتا ہے، جو اس کے حضورؐ سے محبت کی خاص دلیل ہے، لیکن اس فضیلت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ دوسرے انبیاء کو کمتر سمجھتا ہے، اسی طرح اگر صاحب مناقب الاصفیا نے پیروں کے مناقب بیان کرنے میں انتہائی عقیدت کا اظہار کیا ہے تو اس پر اعتراض کرنا اس راہ سے محض ناواقفیت کا اظہار کرنا ہے، پیر کو خلیفۃ اللہ اور قائم مقام رسول اللہ سمجھ کر نبی کی طرح احترام کرنا محض تعلیم و تربیت کی خاطر ہے، جس کے بعد ہی اس راہ کے احوال و مقامات طے ہوتے ہیں، اس سے کوئی مرید اپنے پیر کو صاحب وحی نبی نہیں سمجھتا، اگر کوئی یہ تصور کرتا ہے کہ مرید اپنے پیر کو واقعی نبی سمجھتا ہے، تو ایسا تصور کرنے والا تصوف کا قدر دان نہیں بلکہ ناقد اور معاند ہے،

مضمون نگار نے اس کتاب کو مجروح کرنے کے سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ " رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات لکھنے میں تاریخی حقائق سے زیادہ غلو سے کام لیا گیا ہے، نہر سادہ کے خشک ہو جانے، ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر پڑنے، آتشکدۂ ایران کے سرد ہو جانے وغیرہ کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے۔" ان واقعات کا ذکر سیرت نگار برابر کرتے آئے ہیں، مثلاً قاضی عیاض (المتوفی ۵۴۴ھ) نے اپنی مشہور کتاب شفا میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی رات تعجب خیز باتیں ظاہر ہوئیں، کسریٰ کے محل میں زلزلہ آگیا، اس کے کنگرے گر گئے، بحیرہ طبریہ میں جوش آگیا، اور فارس کی وہ آگ بجھ گئی جو ایک ہزار سال سے نہیں بجھی تھی۔ (ص ۳۶۶)

مولانا شبلی کی سیرۃ النبی سب سے زیادہ مستند سمجھی جاتی ہے، اس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارک کا ذکر ظہور قدسی کے عنوان سے کرتے ہیں، تو اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں،

"ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے سادہ خشک ہو گیا ....."

اب صاحب مناقب الاصفیا نے یہی لکھا تو اس پر اعتراض کرنا کہاں تک صحیح ہے۔

مضمون نگار کا اعتراض ہے کہ

"مولف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی تاریخ دوشنبہ ہفتم ماہ ربیع الاول لکھی ہے لیکن کسی تاریخ، سیرت یا حدیث کی کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے۔"

مولانا شبلی سیرۃ النبی جلد اول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت پر پوری بحث کی ہے، اس میں ہے کہ

"تاریخ ولادت میں اختلاف ہے لیکن اس قدر متفق ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا، اور تاریخ ۸ سے لیکر ۱۲ تک منحصر ہے۔" (سیرۃ النبی جلد اول ص ۶۰)

مختلف فیہ روایت میں اگر کسی مصنف نے کسی روایت کو لکھا تو اس پر اعتراض کیا ہے،

مضمون نگار لکھتے ہیں کہ

"صاحب مناقب الاصفیا ..... کا اعتقاد ہے کہ حضرت آمنہ دوبارہ زندہ ہو کر اسلام لائیں۔"

یہ صریحاً مضمون نگار کی فریب دہی ہے، صاحب مناقب الاصفیا نے حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار خداوند تعالیٰ سے دعا کی کہ آپ کی والدہ حضرت آمنہ زندہ ہو جائیں اور ایمان لے آئیں، خدا نے دعا قبول کی، لیکن اس حدیث کو لکھنے کے بعد امام نووی نے اس حدیث کی تردید میں خود دلائل لکھے ہیں، وہ بھی نقل کر دیے گئے پھر صحیح مسلم کی یہ حدیث بھی لکھ دی گئی ہے کہ

"میں نے اپنے پروردگار سے اپنی ماں کی مغفرت کی دعا کے لیے اجازت چاہی، اللہ تعالےٰ نے اجازت نہیں دی، پھر میں نے اس سے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت مانگی تو اس کی اجازت دیدی۔"

اور پھر وہ کلام پاک کی اس آیت کو بھی لکھتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ نبی اور مسلمانوں کے لیے مشرکوں کی مغفرت کے لیے دعا مانگنا مناسب نہیں۔" اس آیت پر یقین کامل رکھنے کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح مسلم کی روایت اور کلام پاک کی آیت بالکل درست ہے، لیکن حضرت آمنہ کا شمار عام مشرکوں میں نہیں، اس لیے ممکن ہے کہ حضرت آمنہ رسول اللہ کی دعا سے زندہ ہو گئی ہوں، وہ اس پر اعتقاد نہیں رکھتے، بلکہ محض امکان کا اظہار کرتے ہیں، جو "بعضے گویند اور عجب نیست" کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ سے ان کا جذبہ محبت ظاہر ہوتا ہے، اور وہ عام مسلمانوں کی طرح ان کی مغفرت کے خواہاں ہوتے ہیں، اس کا تعلق اعتقاد سے نہیں۔

آخر میں مضمون نگار سے یہ کہنا ہے کہ وہ اپنی مضمون نگاری سے محض اپنی شہرت چاہتے ہیں تو
ان سے کوئی شکایت نہیں لیکن اگر وہ واقعی صوفیائے کرام سے عقیدت رکھتے ہیں اور ان سے
متعلق مفید معلومات فراہم کرنا چاہتے ہیں تو پہلے وہ مخدوم الملکؒ کی اس نصیحت پر عمل کریں کہ
کسی کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ صوفیوں کی راہ میں داخل ہو جب تک کہ وہ ان کے عقیدہ
اور ان کے آداب ظاہری کو یعنی جو معاملات ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان کے باطن کو یعنی جو
معاملات دل سے تعلق رکھتے ہیں، اور اطلاقات کو نہ جان لے کیونکہ ان حضرات کی باتیں زیادہ تر
رموز و اشارات میں ہیں،

"درست نیست مر یکے را کہ در آید در راہ صوفیان مگر پس از آن کہ بداند عقیدت ہائے
ایشان را و آداب ہائے ایشان در ظاہر ایشان یعنی انچہ تعلق بہ معاملات ظاہر دارد
و باطن ایشان را یعنی انچہ تعلق بمعاملات دل ایشان دارد و فہم کند اطلاقات ایشان
را در کلمات ایشان از بہر آں کہ سخن ایں طائفہ بیشتر رموز و اشارات است"

(شرح آداب المریدین)

امید ہے کہ آئندہ جب وہ صوفیائے کرام پر قلم اٹھائیں گے تو اس نصیحت کو پیش نظر رکھیں گے۔

دیوان ہجری

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی، دہلی یونیورسٹی

دربار اکبری کو زینت دینے والی جہاں بہت سی لافانی اور اہم ہستیاں تھیں، وہاں
بیشمار ایسے فنکار، ادیب اور شعراء بھی ہیں جن کو زمانہ تقریباً بھول چکا ہے۔ انہی میں سے
ایک ہجری بھی ہیں، جن کے متعلق مؤلف فہرست کتبخانہ انڈیا آفس نے لکھا ہے کہ غالباً
یہ وہی خواجہ ہجری ہیں جن کا ذکر بدایونی نے کیا ہے، اور جو شیخ احمد جام نامکیؒ[1] کی اولاد
میں تھے، یہ بھی لکھا ہے کہ سفینہ میں ہجری کو فرغانہ کا بتایا گیا ہے، صاحب مجمع النفائس نے ہجری
بخاری لکھا ہے، اور کہا ہے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ اندجانی تھے، اور کچھ دنوں حصار میں بھی
رہے تھے، مگر صاحب عرفات عاشقین نے ان کو ہجری الجامی تحریر کیا ہے۔

بدایونی[2] نے لکھا ہے کہ "ہجری ایک صالح، پاک باطن اور فرشتہ خصلت انسان تھے"
صاحب عرفات نے ہجری کی بڑی تعریف کی ہے کہ "نجابت اور بلند ہمتی کی علامتیں ان کے
وجود کی پیشانی سے نمایاں تھیں اور وہ انتہائی لطیف طبیعت کی وجہ سے ظرافت اور مزاح

---

[1] احمد بن ابی الحسین ابن محمد ابن جریر ابن عبداللہ ابن لیث ابن جریر ابن عبداللہ البجلی الجامی
الخراسانی المکنیٰ بہ ابو نصر و ملقب بہ زندہ پیل و شیخ اسلام و شیخ جام متوفی بسال ۵۲۶ھ یا ۵۳۶ھ
(۱۱۳۱-۳۲ یا ۱۱۴۱-۴۲ء)

[2] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۵۲۲

کی باتیں کرتے تھے صحبتوں کی ان سے زینت ہوتی اور ان کی زندگی پاکیزہ تھی۔[۱] اور ان کو مرزا محمد ہندال[۲] کا مداح بتایا ہے، مؤلف مخزن الغرائب لکھتے ہیں: "بڑے صاحب فضیلت اور صاحب تقوی و طہارت اور فرشتہ خصلت انسان تھے، اور علوم ظاہری میں ان کو کمال حاصل تھا۔" وہ "ظریف" خوش طبع اور خوش خلق تھے، کبھی کسی نے ان کو غمگین نہیں دیکھا، لیکر کروڑ تک جو بھی ان کے ہاتھوں میں آتا، ایثار کر دیتے تھے، اور کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے، اور چھوٹے بڑے سب کے ساتھ ایک طرح سے پیش آتے تھے۔"[۳]

منتخب التواریخ اور مخزن الغرائب میں ان کے دیوان میں پانچ ہزار بیتیں بتائی گئی ہیں، دیوان ہجری کا ایک عمدہ نستعلیق میں لکھا ہوا قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے،[۴] جس پر شاہجہاں[۵]، حمیدہ بانو بنت علی اکبر، سید یوسف علی، امانت خاں[۶] (۱۰۴۲ھ) عظمت اللہ خاں وغیرہ کی مہریں ہیں، اور ان مہروں کے ساتھ یہ عبارت ہے:-

"دیوان ہجری سرکار نواب صاحب ممتاز الدولہ مفتخر الملک حسام جنگ مسٹر رچارڈ جانسن صاحب بہادر دام اقبالہ"

اس نسخہ میں دس قصیدے[۷] شہنشاہ اکبر[۸] کی مدح میں ہیں، اور ہر قصیدہ کے پہلے کوئی رباعی یا قطعہ یا کوئی عبارت ہے، جس سے اس قصیدہ کی تقریب معلوم ہو جاتی ہے، ہجری کے قصیدے عام طور سے اچھے، مرصع، سلیس اور رواں ہیں، ان میں بظاہر کوئی جھول نظر نہیں آتا، سلاست کے ساتھ زور کلام، زندگی اور جوش بھی ہے، ان قصیدوں میں تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں

۱؎ وفات ۹۰۰ھ ۲؎ ۹۲۶ھ ـــ ۹۵۸ھ (۱۵۱۸ء ـــ ۱۵۵۱ء) ۳؎ مخزن الغرائب ص ۱۰۱۵ ۴؎ نمبر ۱۴۴۱
۵؎ ۱۰۳۷ھ ـــ ۱۰۶۸ھ (۱۶۲۸ء ـــ ۱۶۵۸ء) ۶؎ امانت خاں ثانی، میر حسین، پسر سوم امانت خاں خوافی متوفی بسال ۱۱۱۱ھ (۱۷۰۰ء ـــ ۱۶۹۹ء) ۷؎ ۱۵۳ شعر ۸؎ ۹۶۳ھ ـــ ۱۰۱۴ھ (۱۵۵۶ء ـــ ۱۶۰۵ء)

کے لیے بھی اچھا خاصہ مواد ہے،

ان میں پہلا قصیدہ[۱] اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کی تشبیب میں ہندوستان، اور ہندوستانی عورتوں، جوگیوں، بتخانوں اور اشنان کرنے والوں کی تصویر کشی اور دہلی کی توصیف کی گئی ہے:-

ملک ہندوستاں کہ پُر خوبانِ زنگی پیکر است   اصل آں خاک و زمین گویا ز مشک و عنبر است
از سیہ چشمانِ سبز از رنگ شیریں طلعتش   عقل حیران و خیال صورتِ صنعت گر است
جای آں دار د اگر گرد د کسی زنّار بند   در چنیں جائی کہ پُر از دلبران کافر است
ہر طرف بتخانہ ہا پُر از بتانِ دلربا   کز لطافت ہر بتی رشکِ بتان آذر است
روی سینہ رشتۂ زنار ہند و تار تار   در کتاب بت پرستی راستی را مسطر است
جوگی آتش پرستش بین کز آتش دوستی   رو بخاک نیستی غلطیدہ در خاکستر است
شیوۂ مہر و وفا بین در زنِ ہندو کہ او   خویش را افگندہ در آتش ز عشقِ شوہر است
غرق دریای سیاہی ہندواں ہنگامِ غسل   بر لبِ دریا تو گوئی کرگدن عنبر است
حضرت دہلی سواد اعظمش کز روی قدر   پای تخت شاہ عالی شاہ فخرِ اکبر است

دوسرے قصیدے[۲] میں استعارۃً بیرم خاں[۳] کے زوال اور وفات کا ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے:-

این نظم با ستعارہ گشت ست بیاں   از بہر زوال دولت بیرم خاں
این طرفہ کہ با قصیدہ گردید تمام   ایام حیات او و لتش در یک آں

یہ قصیدہ ۹۶۸ھ/ ۱۵۶۱ء میں کہا گیا تھا، جس سال بیرم خاں کی وفات ہوئی تھی،

۱؎ ۱۱۴ شعر ہیں جن کے پہلے ایک رباعی ہے ۲؎ ۷۰ شعر ہیں، جن کے علاوہ ایک رباعی بھی ہے،
۳؎ متوفی بسال ۹۶۸ھ (۱۵۶۱ء)

قصیدہ یہ ہے :-

شد وقت آنکہ باز جہاں گلستاں شود
باغ از گل و شگوفہ جواہر فشاں شود

افسردہ شکل پیر زلیخای روزگار
در دور حسن یوسف گل نوجواں شود

گلہای تازہ بشگفد از گلشن بہار
دلہا شگفتہ ہمچو رخ دلستاں شود

ہر سو بطرف باغ سہی سرو گلرخاں
در ناز و جلوہ آمدہ دامن کشاں شود

زیبندہ ہمچو سنبل نو رستۂ بہار
شاخ بنفشہ بر گل تر سایہ باں شود

تاریکی ضلالت ناپاک مذہباں
پاک از رخ ممالک شاہ جہاں شود

تیسرا قصیدہ[۱] دو دشمنوں، بہادر[۲] اور علی قلی خاں کے مقتول ہونے اور ان کے سر لائے جانے کے موقع پر کہا گیا تھا، جو اس طرح شروع ہوتا ہے،

باز از نسیم فتح تو بشگفتہ بوستاں
وقت گل است و موسم گلگشت گلستاں

اس قصیدہ اور دوسری نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجری دراصل ہمایوں[۳] کے مقرب درباری تھے، اس لیے جب اکبر تخت نشین ہوا تو وہ اس سے بھی اسی التفات کے متمنی ہوئے،

نسبت بحال بندہ ہمی التفات داشت
فردوس بارگاہ شہ جنت آشیاں

ان کو یہ شکایت تھی کہ اکبر نے ہمایوں کے دوسرے درباریوں کی طرح ان کی طرف توجہ نہ کی، اسی قصیدے میں ملبند خاں خواجہ سرا نے ان کی جاگیر کے سلسلے میں جو حق تلفی کی تھی، اس کا ذکر کیا ہے،

ہر کس ز بندگان شہنشہ کہ ماندہ بود
از دولت تو یافت دو صد گونہ قدردان

غیر از من فقیر کہ در دور شہریار
سودی ز بخت خویش ندیدم بگمرزیان

[۱] ۸۲ شعر کے علاوہ ۳ شعر کا ایک قطعہ بھی ہے [۲] بہادر پسر سعید بدخشی متوفی بسال ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) [۳] ۹۳۷ھ - ۹۴۷ھ / ۱۵۳۰ء - ۱۵۴۰ء ، ۹۶۲ھ - ۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء - ۱۵۵۶ء

حالا ز یک تکی کہ بود نصف حاصلش
چوں بگذرد معاش من و جمع ناتواں

از ضعف طالع ار نشود بیشتر ز پیش
وز لطف شہریار شود بندہ شادماں

شاہا کرم نمای ہماں جایگیر را
فرمای تا دہند بمہر او رنگ نشاں

گر رفتہ است حاصل یک فصل بی حساب
از جایگیر بندہ بنا خن ملبند خاں

ظلمی کہ کردہ خواجہ سرا در دیار ہند
آن ظلم در ہرات نکردہ است ترکماں

چوتھا قصیدہ[۱] زیادہ طولانی ہے جس کی تشبیب میں بڑے لطف اور روانی سے بہار اور مے نوشی کے جزئیات کا ذکر کیا گیا ہے :-

باز وقت است کہ گل پردہ ز رخ برگیرد
صحبت مرغ سحر خیز بگل در گیرد

پی رنداں در خمخانہ کشاید خمار
وز سر دختر از مقنع و معجر گیرد

ز آستیں ساعد سیمیں بدر آرد ساقی
پنجہ در مرغ صراحی زدہ ساغر گیرد

ہمہ گیرند قدح از کف ساقی و دلم
بوسہ از ساعد آں سرو سمنبر گیرد

ذکر گویان بہوای قد دلجوی حبیب
آشیاں ساختہ بر شاخ صنوبر گیرد

قمری عاشق شیدا بتماشا گر سرو
میوۂ وصل ز نخل قد دلبر گیرد

ہجری مذہبی آدمی تھے اور اکبر کے دور کی بعض بدعتوں کو پسند نہ کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ شاہی حکم سے مسجدوں اور مدرسوں سے تصویریں ہٹالی جائیں :

مسجد و مدرسہ مپسند کہ از صورت کفر
نقش و تصویر چو بتخانۂ آذر گیرد

ہجری اکبر کو موقع موقع سے نصیحتیں کرتے رہتے تھے، اسی قصیدہ میں شہنشاہ کو غلہ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور اس کے اسباب کی طرف متوجہ کیا ہے :-

[۱] ۱۲۱ شعر ہیں ان کے علاوہ ایک شعر عنوان میں ہے۔

پیلباں تو اگر غلہ ز دہقاں نکشد | غلہ قیمت زچہ رو در دہ و کشور گیرد

نیز اکبر کو اس کے ژولیدہ بالوں پر متنبہ کیا ہے کہ سر کے بالوں کو مناسب طرح سے رکھے اور ان کو زیادہ بڑھنے نہ دے، اور ممکن ہے یہ نکتہ اس قصیدہ کی امتیازی خصوصیت ہو:

بر سر اسر و تو گر ناز سمن بر گیرد	موی ژولیدہ چرا جای چو افسر گیرد
بر سر شہ کہ گل و تاج مرصع زیبد	موی ز اندازہ نکو نیست کہ سر بر گیرد
از سرت موی بپا کی و لطافت تبراش	کہ صفا از مہ و خورشید نکوتر گیرد
دور کن موی سر از گوہر پاکی و گداز	کہ ز خط آئینہ حسن تو جوہر گیرد

دو قصیدے [1] گجرات کی دوسری فتح [2] اور بنگال کی فتح [3] پر کہے گئے تھے۔

ہجری کے قصیدوں سے چند سلیس و رواں اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے قصیدہ کی شان ٹپکتی ہے:

روز اول کہ می و دیر مغاں ساختہ اند	روزی در دکشاں رطل گراں ساختہ اند
چشم مستان صبوحی زدہ عاشق را	بر گل عارض ساقی نگراں ساختہ اند
قدسیان پیر زلیخای جہاں را بستہ	عقد با یوسف حسن تو جواں ساختہ اند
ترا چو سبزہ تر بر گل عذار آمد	ز باغ حسن تو بوی بنفشہ زار آمد
بنفشہ سجدہ کناں از سر نیاز رسید	شگوفہ سیم بکف از پی نثار آمد

ایک مفصل ترکیب بند ہے [4] جس میں ہمایوں کا مرثیہ ہے، اور اسی کے ساتھ اکبر کی تخت نشینی پر اظہار مسرت کیا گیا ہے، اس مرثیہ کے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن سے ہجری کے زور بیان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لہ ۷۷ شعر ہیں، شعر کے ۲ ۹۸۰ھ (۱۵۷۳ء) ۳ ۹۸۲ھ (۱۵۷۵ء) ۴ ۱۲۹ شعر ہیں جنکے پہلے ایک رباعی بھی ہے

دی چمن یاد ز سر منزل جاناں می داد	خندۂ گل خبری زاں گل خنداں میداد
دوش با غمزدگان شب تاریک فراق	مژدۂ صبح طرب مرغ خوش الحاں می داد
ای جہاں دیدہ بگو گردش ایام چہ کرد	چرخ بی مہر بآں سرو گل اندام چہ کرد
دوش نالان غزلی مرغ خوش الحاں می خواند	ظاہرا مرثیۂ خسرو دوراں می خواند
رفتی و از تو بدل حسرت بسیار بماند	داغہا بر جگر و سینۂ افگار بماند
کہ جدا بی رخ تو در گل و نسریں بینم	دور از آں جعد سیہ سنبل مشکیں بینم
چوں کنم بی قد رعنای تو نظارۂ سرو	بی رخ پر عرقت درمہ و پروین بینم

اس کے بعد ایک قطعہ ہمایوں کی تاریخ وفات میں ہے، مگر تعجب ہے کہ اس دیوان میں ہجری کا کوئی اور قصیدہ یا کلام ایسا نہیں ملتا جس میں ہمایوں کی مدح کی گئی ہو، اور یہ معلوم ہو کہ وہ اس کا درباری شاعر تھا۔

اس کے بعد پندرہ مذیل غزلیں ہیں، جن میں قصیدہ کا انداز ہے، اور جن کو کسی نہ کسی تقریب میں کہا گیا ہے، مثلاً ایک میں ولادت کی مبارک باد ہے، بعض اور دلکش اشعار یہاں بطور نمونہ کے نقل کیے جاتے ہیں:

ہمرہ قافلۂ عشق بسودای رخت	جاں بکف ماندہ بایں مرحلہ گاہ آمدہ ایم
باز در بزم شہ دوراں خروش دیگر است	بادہ را در ساغر و پیمانہ جوش دیگر است

غزلوں کے بعد بارہ قطعے [1] اور سات رباعیاں ہیں، ان میں سے ایک قطعہ کسی مکان کی تعمیر کے موقع پر کہا گیا تھا، زیادہ تر قطعوں میں ہجری نے اپنی جاگیر میں اضافہ کی خواہش اور اپنی تنگی معاش کی شکایت کی ہے اور بتایا ہے کہ .... ان کا سالانہ خرچ

لہ ۴۴ شعر ہیں

تین چار لاکھ ہے، اور آمدنی صرف پچاس بدرہ[1] ہے، وہ بھی جب فصل ٹھیک ہو، مگر مصیبت یہ ہے کہ قحط اور بارش کی کمی کی وجہ سے فصل خراب ہو جاتی ہے، ہجری نے اپنی جاگیر میں ایک عمارت اور کنواں بنوایا تھا، اور ایک مسجد اور خانقاہ بنانا چاہتے تھے، ان کے دشمنوں نے ان کی زندگی میں بادشاہ کو ان کی موت کی خبر دیدی، بیماری کی وجہ سے ان کے بال گر گئے تھے، منافقوں نے شکایت کر دی کہ وہ دربار میں بغیر سر کے بالوں کے آتے ہیں، ان کے قطعوں سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے ان کی جاگیر زیادہ تھی، پھر کم ہوتے ہوتے صرف ایک گاؤں تک محدود رہ گئی، اور وہ جس خدم و حشم سے رہتے تھے، اس کے لیے یہ آمدنی کافی نہ تھی، اس گاؤں کا نام ملک پور تھا جو پرگنہ کہری میں تھا، اس کی آمدنی صرف چالیس بدرہ تھی، اور ان کا سالانہ خرچ تین لاکھ روپیہ کے قریب تھا، وہ تقریباً دو سو آدمیوں کے کفیل تھے، جن میں زیادہ تر مومن بندے تھے، اس پرگنہ پر بھی حاکم کی نظر تھی، غالباً کسی موقع پر ہجری کو حکم ملا تھا کہ وہ ملک پور کی جاگیر مظفر خاں[2] کے حوالہ کر دیں جس سے انھیں بڑی تکلیف ہوئی، بہر حال انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ اگر یہ جگہ نہیں ملتی تو پھر کوئی دوسری جگہ مل جائے، ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے "بڈہانہ[3]" کو جس کی آمدنی پچاس بدرہ تھی، فقرا کے لیے وقف کر دیا تھا، مگر دو سال ہوئے کہ خواجہ جہاں[4] نے اس کو لے لیا جس کی وجہ سے ان کے چالیس سال کے تعلقات خراب ہو گئے۔

---

[1] فرہنگوں میں ہے کہ ایک بدرہ میں دس ہزار درہم یا سات سو اشرفیاں ہوتی ہیں، مگر پتہ نہیں چلتا کہ یہاں بدرہ سے کیا مراد ہے۔ [2] مظفر خاں تربتی، خواجہ مظفر علی، دیوان بیرم خاں، متوفی بسال ۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء) [3] Budhana یوپی کے مظفر نگر ضلع میں ایک تحصیلی قصبہ ہے، جو دریائے ہنڈن (Hindan) کی داہنی طرف واقع ہے۔ [4] خواجہ جہاں ہروی، خواجہ امین الدین محمود مشہور بامین، متوفی بسال ۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء)

مآخذ

۱۔ تقی الدین محمد اوحدی : عرفات عاشقین، نسخۂ خطی شمارہ ۶۸۵، خدا بخش لائبریری پٹنہ،
۲۔ سراج الدین علی خاں آرزو : مجمع النفائس، نسخۂ خطی شمارہ ۶۹۵، خدا بخش لائبریری پٹنہ۔
۳۔ نواب صدیق حسن خاں : شمع انجمن، مطبع رئیس المطابع شاہجہانی۔
۴۔ غلام علی آزاد : ید بیضا، نسخۂ خطی شمارہ ۶۹۱، خدا بخش لائبریری پٹنہ۔
۵۔ امجد علی ہاشمی سندیلوی : مخزن الغرائب، نسخۂ خطی شمارہ ۷۱۳، خدا بخش لائبریری پٹنہ۔
6. Mulla Abdul Qadir Badayuni: Muntakhab-ut-Tawarikh, translated by George S. A. Ranking, Baptist Mission Press, Calcutta. Vol. III
7. Hermann Ethe: Catalogue of Persian Manuscripts in The Library of India Office Oxford, 1903
8. Vincent A. Smith: Akbar The Great Moghul Second Edition, S. Chand & Co 1962.

دینور اور مشائخ دینور

از جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی

معارف (اگست ۱۹۶۵ء) میں جناب سید شمیم احمد صاحب، ڈھاکہ کا ایک مقالہ مذکورۂ بالا عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دینور جس کی طرف حضرت ممشاد، اور حضرت احمد اسود وغیرہ منسوب ہیں، سیلون کا ایک شہر تھا، انھوں نے اپنے اس خیال کی بنیاد یہ بتائی ہے کہ ابن بطوطہ نے جزیرہ "لنکا" کے حال میں نہایت تفصیل و تشریح کے ساتھ دینور کا ذکر کیا ہے،

اس سلسلہ میں مجھے یہ کہنا ہے کہ صرف اتنی سی بات کہ لنکا کے نواح میں ایک دینور پایا جاتا ہے، یہ خیال قائم کرنے کے لیے کہ حضرت ممشاد وغیرہ اسی دینور کی طرف منسوب ہیں، کافی نہیں ہے، اس خیال کی صحت کا امکان اُس وقت تھا، جب اس دینور کے علاوہ کسی دوسرے دینور کا ذکر کہیں نہ ہوتا، یا ہوتا مگر کسی محقق کی یہ تصریح پائی جاتی کہ حضرت ممشاد وغیرہ لنکا ہی والے دینور سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی صحیح اور متحقق نہیں ہے۔

پہلی بات، یعنی یہ کہ "لنکا کے دینور کے علاوہ کسی دوسرے دینور کا کہیں ذکر نہیں ہے" اس لیے صحیح نہیں ہے کہ خود مقالہ نگار کو تسلیم ہے کہ

"دارا شکوہ نے حضرت ممشاد کے ذکر میں لکھا ہے کہ دینور قرمیسین[1] کے قریب جبل کے شہروں میں سے ایک شہر کا نام ہے"[2]،

اگرچہ مقالہ نگار نے اس بیان کی نسبت بالکل بے وجہ اور بلا دلیل یہ لکھدیا ہے، کہ "یہ غلط ہے، دینور ایران اور عراق میں نہیں بلکہ سیلون میں تھا"۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ دارا شکوہ کا بیان ایک تاریخی حقیقت ہے، اس کا انکار مکابرہ اور اس کی تغلیط ناممکن ہے،

(۱) سب سے پہلے تاریخ کے ایک طالب علم کو عراق و ایران کی اسلامی فتوحات کے سلسلے میں دینور کا نام ملتا ہے، تیسری صدی ہجری کا مشہور مورخ بلاذری (المتوفی ۲۷۹ھ) اپنی کتاب فتوح البلدان میں لکھتا ہے:-

"قالوا انصرف ابوموسیٰ الاشعری من نهاوند، وقد كان سار بنفسه اليها على بعث اهل البصرة ممد النعمان بن مقرن فمر بالدينور، فاقام عليها خمسة ايام قوتل منها يوما واحدا ثم ان اهلها اقروا بالجزية والخراج وسألوا الامان على انفسهم واموالهم واولادهم فاجابهم الى ذالك وخلف بها عامله فی خيل، ثم مضى الى ماسبذان فلم يقاتله اهله، وصالحه اهل السيروان على مثل صلح الدينور و على ان يؤدوا الجزية والخراج"[3]۔

---

[1] معارف میں یونہی چھپا ہے، مگر صحیح "قرمیسین" ہے۔ [2] معارف ص ۱۱۱

[3] فتوح البلدان، ص ۳۱۵

اس عبارت کو بغور پڑھیے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (۱) نہاوند سے بصرہ واپس ہوتے ہوئے حضرت ابو موسیٰؓ کو درمیان میں دینور ملا تھا۔ (۲) دینور کے بعد وہ ماسبذان گئے (۳) ماسبذان کے بعد ان کو سیروان ملا تھا، اور ہر جغرافیہ دان جانتا ہے کہ یہ سارے مقامات ایران میں ہیں، اور اسی لیے یہ سب نام فتوحات عراق وایران کے سلسلے میں آئے ہیں۔

(۲) مورخ ابن الاثیر نے بھی کامل میں اسی کے قریب لکھا ہے، ملاحظہ ہو واقعات ۲۱ھ۔ زیر عنوان ذکر فتح الدینور الخ[1]

(۳) یاقوت حموی، معجم البلدان میں لکھتے ہیں:

"دینور مدینة من اعمال الجبل قرب قرمیسین ینسب الیها خلق کثیر وبین الدینور وھمذان نیف وعشرون فرسخا ومن الدینور الی شھرزور اربع مراحل۔

داراشکوہ کا بیان، یاقوت کے ابتدائی فقرہ کا لفظ بلفظ ترجمہ ہے، یاقوت نے اس عبارت میں دینور کا محل وقوع بھی بتادیا ہے کہ وہ ہمدان (مشہور ایرانی شہر) سے بیس فرسخ (۶۰ میل) سے کچھ زیادہ دوری پر واقع تھا۔ اور ہمدان کی نسبت لکھا ہے کہ وہ چوتھے اقلیم میں ۷۳ درجہ طول بلد اور ۳۶ درجہ عرض البلد شمالی پر واقع ہے۔

(۴) سمعانی کتاب الانساب میں، اور ابن الاثیر اللباب میں لکھتے ہیں:۔

"الدینوری ...... ھذہ النسبة الی الدینور، وھی بلدة من بلاد الجبل[2] عند قرمیسین[3]"

[1] کامل لابن الاثیر، ج ۳ ص ۷، [2] بلد الجبل یا بلاد الجبال ایران کے ایک حصہ کو کہتے تھے [3] اللباب ج ۱ ص ۴۴۰

یاقوت، سمعانی، اور ابن الاثیر نے دینور کو قرمیسین کے قریب بتایا ہے، اور قرمیسین کی نسبت سمعانی وغیرہ نے لکھا ہے:

ھی مدینة بجبال العراق علی ثلاثین فرسخا من ھمذان عند الدینور، ویقال لھا کرمان شاہ[1]"

(یعنی قرمیسین جبال عراق کا ایک شہر ہے، ہمذان سے تیس فرسخ کے فاصلہ پر دینور کے پاس واقع ہے)

قرمیسین کی نسبت یہی بات یاقوت نے بھی اس اضافہ کے ساتھ لکھی ہے کہ وہ ہمذان اور حلوان کے درمیان اس شاہراہ پر واقع ہے، جس سے ایرانی حجاج کا قافلہ گذرتا ہے۔

اور صاحب قاموس نے لکھا ہے

"قرمیسین بالکسر بلدة قرب الدینور معرب کرمان شاھان"

(باب السین فصل القاف)

دینور کی نسبت ایسا ہی بیان دوسری بہت سی کتابوں میں ملتا ہے، آخر میں ہم صاحب المنجد کا بیان پیش کرتے ہیں۔ وہ المنجد فی الادب والعلوم کے صفحہ ۲۰۶ پر لکھتا ہے:۔

دینور مدینة من امھات مدن الجبال فی مادی دخلھا العرب (۶۴۲) بعد واقعة نھاوند والبصرة، وسموھا ماہ الکوفة کانت عامرة غنیة علی ایام الامویین والعباسین

[1] اللباب، ج ۲ ص ۲۵۵

ضربت فی حروب مرداویج الجیلانی، اجهز علیها تیمور (۱۴۰۰)

اس میں صاحب منجد نے تصریح کی ہے کہ دینور کوہستان میں ایک اہم شہر تھا، عباسیوں کے عہد تک نہایت آباد تھا۔ مرداویج جیلانی کی جنگوں میں تباہ ہوا اور اس کی تباہی میں رہی سہی کسر تیمور نے پوری کردی، صاحبِ منجد نے یہ تصریح بھی کردی کہ وہ (Media) میں تھا۔

ان تصریحات کے بعد یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ لنکا کے علاوہ ایران (یا یوں کہیے کہ بلاد جبال یا کوہستان عراق) میں بھی ایک دینور تھا، اور وہ نہایت مشہور ایک تاریخی مقام تھا۔ لنکا والے دینور کی شہرت اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں تھی، بلکہ ابن بطوطہ سے پہلے غالباً کسی عرب مورخ نے اس کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔

رہا مقالہ نگار کا مناقب الاصفیاء کے حوالہ سے یہ لکھنا کہ رسالہ قشیریہ میں جہاں خواجہ احمد سیاہ دینوری کا تذکرہ ہے، وہاں یہ لکھا ہے کہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کوئی دیہات ہے یا شہر (معارف ص ۱۱۱) تو یہ بات قرین صواب نہیں معلوم ہوتی رسالہ قشیریہ مطبوعہ مصر ۱۲۸۴ھ کے صفحہ ۴۰ پر احمد اسود دینوری کا ذکر ہے، اور وہاں ایسی کوئی بات مذکور نہیں ہے۔ اگر کسی دوسری جگہ یہ بیان ہو تو مقالہ نگار اسکی نشاندہی فرمائیں۔

بہرحال ان حالات میں لنکا والے دینور کو تسلیم کرنا، اور ایران والے دینور کا انکار کرنا تحقیق اور ریسرچ کی کوئی قابل تعریف مثال نہیں ہے۔

اس کے بعد دوسری بات کو لیجئے، تو جہاں تک ہمارے معلومات کا تعلق ہے

مقالہ نگار کے سوا کسی مورخ یا تذکرہ نگار یا کسی محقق نے حضرت ممشاد وغیرہ کو لنکا والے دینور کی طرف منسوب نہیں بتایا ہے، اس کے برخلاف بکثرت محققین نے ان لوگوں کو ایران والے دینور کی طرف منسوب قرار دیا ہے۔

ممشاد دینوری کے باب میں دارا شکوہ کا بیان آپ پڑھ چکے ہیں، ان سے پہلے شیخ الاسلام ہروی کا بیان طبقات الصوفیہ (مطبوعہ کابل) میں ہے:۔

"ممشاد الدینوری سید و شیخ مشائخ عراق از مہینانِ مشائخ است"

طبقات کا محشی لکھتا ہے:۔

"منسوب است بہ دینور یکے از بلاد جبال نزدیک کرمانشاہ"[1]

مولانا جامی نفحات الانس کے منہیہ میں ممشاد دینوری کے حال میں لکھتے ہیں:

"الدینوری منسوب الی دینور بکسر الدال وسکون الیاء آخر الحروف وفتح النون والواو وفی آخرها الراء وهی بلدة من بلاد الجبل عند قرمیسین معرب کرمانشاه"[2]

مولانا یونس بہاری نے اسی عبارت کا حوالہ دیا ہے، مگر مقالہ نگار کو یہ عبارت اس لیے نہیں مل سکی کہ ان کے پاس نفحات مطبوعہ نولکشور پریس ۱۹۰۵ء موجود نہیں تھی، اگرچہ مولانا یونس نے مولانا جامی کی عبارت کا صحیح ترجمہ نہیں کیا ہے۔

مقالہ نگار نے ابوبکر کسائی دینوری کا تعلق بھی لنکا سے بتایا ہے،[3] مگر شیخ الاسلام ہروی فرماتے ہیں:۔

---

۱ طبقات الصوفیہ، ص ۲۰۹ ۲ نفحات الانس ص ۹۳ ۳ معارف ص ۱۱۶، ۱۱۷

"بوبکر کسائی دینوری از قہستان عراق بودند بدینور"۔[1]

اور مولانا جامی نفحات الانس میں لکھتے ہیں ؛

"ابوبکر کسائی دینوری از قہستان عراق بودہ بدینور"۔[2]

مقالہ نگار نے ابوعبداللہ دینوری کا تعلق بھی لنکا سے بتایا ہے، مگر طبقات الصوفیہ کا محشی ان کے حال میں لکھتا ہے :

"منسوب است بہ دینور کہ شہریست از جبال نزدیک کرمان شاہ، وبسا از اہل علم بداں منسوبند"۔[3]

ان حضرات کے علاوہ جن لوگوں کے نام مقالہ نگار نے دیے ہیں وہ سب بھی اسی مشہور دینور سے تعلق رکھتے تھے، اور ان کے ماسوا بھی بکثرت علما، و مشائخ کا تعلق اسی دینور سے ہے، مثلاً ابوبکر ابن السنی دینوری (شاگرد امام نسائی) ابوعبداللہ بن فنجویہ دینوری (راوی سنن نسائی) اور یہاں دینوری وغیرہ۔

یہ تمام حضرات یا ان میں سے کوئی لنکا والے دینور کی جانب منسوب ہوتا تو لازمی طور پر مورخین اس کی تصریح کرتے، مورخین کی مستمر عادت ہے کہ ایک نام کے دو شہر ہوتے ہیں اور ان میں ایک زیادہ مشہور ہو، دوسرا کم، تو جو شخص غیر مشہور شہر کی طرف منسوب ہوتا ہے، اس کے باب میں صراحت کر دیتے ہیں کہ یہ اس غیر مشہور شہر سے تعلق رکھتا ہے، جیسے صنعا نام کے دو شہر ہیں، ایک یمن میں، دوسرا شام میں تو جو آدمی صنعا، شام کا رہنے والا ہوتا ہے، اس کی نسبت بتا دیتے ہیں کہ ھو من صنعاء الشام۔ اس کی اور بھی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

---

[1] طبقات الصوفیہ، ص ۲۷۸ [2] نفحات الانس ص ۸۳ مطبوعہ نولکشور، ۱۸۷۴ء ونسخہ قلمی ورق ۵۸،

[3] طبقات الصوفیہ ص ۴۷۹

اس مقالہ میں مذکورۂ بالا امور کے علاوہ اور بھی بعض اوہام ہیں، مثلاً خواجہ ممشاد دینوری کو خواجہ عبداللہ خفیف کا خلیفہ بتایا گیا ہے،[1]

اس میں دو وہم ہیں، ایک تو عبداللہ خفیف کے بجائے ابوعبداللہ خفیف ہونا چاہیے، دوسرے ممشاد کو ابوعبداللہ خفیف کا خلیفہ بتانا بالکل خلاف واقعہ ہے، ممشاد دینوری، ابوعبداللہ خفیف کے مشائخ کے طبقہ میں تھے، ان کی وفات بتصریح مقالہ نگار ۲۹۹ھ میں ہوئی ہے، اور ابوعبداللہ خفیف کی ۳۷۱ھ میں، تذکروں میں یہ ذکر تو آتا ہے کہ ابوعبداللہ خفیف نے ممشاد کو خواب میں دیکھا، لیکن بیداری میں دونوں بزرگوں کی باہمی ملاقات کا ذکر ہمارے علم میں کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا ہے۔

مقالہ نگار کا ایک وہم یہ بھی ہے کہ انھوں نے ابوعبداللہ خفیف کا سال وفات ۳۳۱ھ بتایا ہے، مگر اس میں غالباً انھوں نے مولانا جامی کا اتباع کیا ہے، نفحات الانس میں مولانا جامی نے معلوم نہیں کس طرح یہی سال وفات لکھدیا ہے، حالانکہ ان کے علاوہ ہم نے جہاں دیکھا سب نے ۳۷۱ھ لکھا ہے، چنانچہ ابوعبداللہ خفیف کے شاگرد و سیرت نگار ابوالحسن دیلمی نے سیرت شیخ میں، ابوعبدالرحمن سلمی نے طبقات الصوفیہ میں، اسی طرح شیخ الاسلام ہروی نے طبقات ص ۵۵۴ میں، ابونعیم نے حلیۃ الاولیا، ج ۱۰ ص ۳۸۵ میں، ابن الجوزی نے منتظم ج ۷، ص ۱۱۲ میں، یافعی نے مرأۃ الجنان ج ۲ ص ۳۹۷ میں، ذہبی نے العبر میں، سبکی نے طبقات شافعیہ ج ۲ ص ۱۵۴ میں، عبدالحی بن العماد نے شذرات الذہب ج ۳ ص ۷۷ میں، اور دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا ص ۱۱۱ میں ۳۷۱ھ ہی لکھا ہے،

---

[1] معارف ص ۱۰۷ و ۱۱۶

ادبیات

شانِ مصطفائیؐ

از
جناب وارث الفادری

جنتِ چشم تر نہیں ملتی — یعنی وہ رہگذر نہیں ملتی

جب تک انکی نظر نہیں ملتی — نگہِ حق نگر نہیں ملتی

خلق کی کچھ خبر نہیں ملتی — آپ سے پیشتر نہیں ملتی

نعمت، اللہ کی وہ کونسی ہے — جو محمدؐ کے گھر نہیں ملتی

مشرق و مغرب و جنوب و شمال — ان کی رحمت کدھر نہیں ملتی

منزلِ حق بغیر عشقِ رسولؐ — بخدا عمر بھر نہیں ملتی

اہلِ طیبہ کی شام ہے جیسی — ہم کو ویسی سحر نہیں ملتی

شبِ معراج جبرئیلؑ کو بھی — ان کی گردِ سفر نہیں ملتی

واہ کیا شانِ مصطفائیؐ ہے — جو بہ ذاتِ دگر نہیں ملتی

رحمتِ مصطفےٰ کہاں وارث
ہو بہو، سر بسر نہیں ملتی

ساقی!

از جناب قمر سنبھلی

وہ پہلا سا سماں اگلی سی وہ باتیں کہاں ساقی — زمیں ہم سے پھری بدلا ہے کیسا آسماں ساقی

وہ دورِ میکشی وہ جام، وہ بادہ کہاں ساقی — کہ رندانِ قدح کش آج ہیں فاقہ کناں ساقی

یقیناً منتشر ہوگی مثالِ کہکشاں ساقی — ابھر کر مطلعِ عالم پہ میری داستاں ساقی

نشیمن کے بنانے میں حوادث تو نہیں حائل — غضب یہ ہے مخالف ہو گیا ہے باغباں ساقی

ہمیں کیا گردشِ دوراں مٹائے گی زمانے سے — ہمارا تذکرہ ہے داستاں در داستاں ساقی

بزعمِ جہل اسے راحت کدہ سمجھے ہیں دیوانے — یہ دنیا در حقیقت ایک ہے خوابِ گراں ساقی

نشانِ راہِ منزل رہ گیا چھپ کر غباروں میں — زمیں سے تا فلک اڑتی ہے گردِ کارواں ساقی

نظامِ میکدہ برہم کیا دورِ زمانہ نے — نہ وہ میخوار ہیں باقی نہ وہ پیرِ مغاں ساقی

بھرے گلشن پہ اب تو دور دورہ ہے بلاؤں کا — ستم ہے فتنہ پرور گلستاں در گلستاں ساقی

یہ کیسا سرخ جوڑا مادرِ گیتی نے بدلا ہے — فضائے دھر سر تا سر ہوئی ہے خونفشاں ساقی

جہاں میخانۂ ہستی کے رہبر راہ زن نکلیں — سلامت کیوں بھلا منزل پہ پہنچے کارواں ساقی

کہاں قرآں چھپے جا کر کدھر ایماں اماں پائے — تُلے ہیں دیں فروشی پر حرم کے پاسباں ساقی

اسی کا عکسِ رخ ہے جو رمہ کلیوں میں پھولوں میں — منور ہے اسی کے نور سے سارا جہاں ساقی

قمر کیا کوئی بھی مقصد کو اپنے پا نہیں سکتا
مخالف جس کے ہو جائیں زمین و آسماں ساقی

غزل

از

جناب محمد منشاء الرحمٰن خاں صاحب منشاء

سچی علم کے فیضان سے ہم باز آئے
اے خردِ چل ترے احسان سے ہم باز آئے

جس کا مقصود نظر صرف ہوسنا کی ہو
ایسی رنگینیٔ وجدان سے ہم باز آئے

اور ہیں وہ سروسامان پہ جو مرتے ہیں
آرزوئے سروسامان سے ہم باز آئے

کسی صورت بھی سکونِ دل کو نہیں ہے حاصل
زیست کے نت نئے ہیجان سے ہم باز آئے

"سانس لیتے ہیں تو زخموں سے لہو رستا ہے"
اپنے اس حالِ پریشان سے ہم باز آئے

رنگ و بو کے لیے ترسیں تو کہاں تک ترسیں
بس بہارِ گل و ریحان سے ہم باز آئے

اُس ہی آس پہ جینے کی بھی حد ہوتی ہے
آپ کے وعدہ و پیمان سے ہم باز آئے

اپنی ہستی سے بھی ہم ہونے لگے بیگانے
تم کو اپنانے کے ارمان سے ہم باز آئے

شعر ہی جان ہو منشاءؔ، تو کوئی بات بھی ہے
صرف الحان ہی الحان سے ہم باز آئے

مطبوعات جدیدہ

کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ۔ از امام محمد بن حسن الشیبانی۔ صفحات ۵۸۸۔

ٹائپ عمدہ، ناشر لجنۃ احیاء المعارف النعمانیۃ، حیدرآباد دکن

دوسری صدی ہجری میں حدیث و آثار کے جو مجموعے مرتب ہوئے ان میں امام محمدؒ کی کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ بھی ہے۔ اس موضوع پر امام محمدؒ نے کئی کتابیں لکھی ہیں، مگر اسی کتاب کو ایک خاص خصوصیت حاصل ہے، یہ کتاب اس سے بہت پہلے ہندوستان میں چھپ چکی ہے، اب اسے متعدد نسخوں کی مدد سے لجنۃ احیاء النعمانیہ نے دوبارہ شائع کیا ہے، اصل متن تو ایک جلد سے زیادہ نہیں ہے، مگر اس پر مفتی مہدی حسن صاحب نے مفصل حاشیہ لکھا ہے، اس لیے اب اس کو تین جلدوں میں شائع کیا جا رہا ہے، یہ پہلی جلد ہے، جس میں طہارت، صلوٰۃ، صوم اور زکوٰۃ کے ابواب ہیں۔

امام محمدؒ امام مالکؒ کی خدمت میں تین برس تک رہے، اس مدت میں انھوں نے ان سے اور مدینہ منورہ کے دوسرے شیوخ حدیث سے پورا استفادہ کیا، امام مالک سے تقریباً نوسو سے زیادہ حدیثیں سماع کیں، جنھیں انھوں نے موطا میں جمع کر دیا ہے، یہ چونکہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کی صحبت سے فیضیاب ہو کر امام مالکؒ کی خدمت میں گئے تھے، اس لیے درس میں امام مالک سے اہل مدینہ کے مسلک کے بارے میں بہت سے عالمانہ سوالات کرتے تھے، اور امام مالکؒ ان کا جواب دیتے تھے، درس سے باہر بھی مدینہ کے دوسرے شیوخ سے ان کے مباحثے ہوتے رہتے تھے، وہ اہل مدینہ کے مسلک کے دلائل بیان کرتے اور یہ اہل کوفہ کے مسلک کی وکالت کرتے تھے، انہی مباحثوں اور

دلائل کو امام محمدؒ نے کتاب الحجۃ میں جمع کر دیا ہے، کتاب کے راوی ان کے مشہور شاگرد عیسیٰ بن ابان ہیں، کتاب میں وہ سب سے پہلے امام ابو حنیفہ کی رائے نقل کرتے ہیں، پھر امام مالک یا اہل مدینہ کی رائے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ پھر امام صاحب کے مسلک کے دلائل حدیث و آثار سے لاتے ہیں، پھر اہل مدینہ کے دلائل لاکر اس پر اپنا رد و مناقشہ پیش کرتے ہیں، اس کتاب کی اشاعت سے ایک طرف یہ پتہ چلتا ہے کہ امام صاحب کی نظر حدیث و آثار پر کتنی وسیع اور گہری تھی، دوسری طرف ان کے دلائل کا علم براہ راست راوی اول کے ذریعہ ہوتا ہے، جس سے پورا اطمینان پیدا ہوتا ہے، اس کتاب میں امام محمدؒ نے ستّو سے زیادہ شیوخ حدیث کی روایتوں سے استدلال کیا ہے، اس لیے اس کی اشاعت ایک دینی خدمت بھی ہے، جس سے فقہ حنفی کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں،

المنتخب - از عبدالرحمٰن بن حمد بن زید المغری، صفحات ۳۱۶ ٹائپ عمدہ، ناشر المکتبۃ الاسلامیہ للطباعۃ والنشر دمشق۔

عبدالرحمٰن بن حمد المغری نے مختلف کتابوں سے انتخاب کر کے تمام مشہور قبائل کے انساب کو جمع کر دیا ہے، اسی کے ساتھ ایک اور رسالہ اسی میں شامل کر دیا گیا ہے، شروع میں حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کی اولاد کا تذکرہ ہے، پھر مملکت سبا کا ذکر ہے، اس کے بعد حجاز، یمن، حضرموت، مہرہ، نجد وغیرہ کے قبائل کی تفصیل ہے، تاریخ اور انساب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب بڑی دلچسپی کا سبب ہوگی۔

ترجمان القرآن - از مولانا ابوالکلام آزادؒ، صفحات ۵۵۴، ٹائپ متوسط کاغذ معمولی، ناشر ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی، قیمت :- ۲۰ عہ

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تفسیر ترجمان القرآن کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے، مگر اب بہت کم ملتی ہے۔

اس لیے ساہتیہ اکیڈمی نے اس کو تصحیح، ترتیب اور تہذیب و تحشیہ کے جملہ لوازم اور مکمل انڈکس کے ساتھ بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، پہلے ایڈیشنوں میں پہلی جلد سورۂ انعام تک کی تفسیر پر مشتمل تھی جس میں سورہ فاتحہ کی تفسیر جو مولانا کا شاہکار اور اس تفسیر کی جان ہے، کئی سو صفحوں میں تھی، اسی لیے ساہتیہ اکیڈمی نے اس کو ایک مستقل جلد بنا دیا ہے، اور پہلی جلد اسی پر مشتمل ہے، نفس تفسیر پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، ٹائپ اور کاغذ میں اس سے زیادہ اہتمام ہو سکتا تھا، تاہم یہ بھی غنیمت ہے، مولانا کی تصانیف کی اشاعت کا مقصد افادۂ عام ہے۔ اس لیے قیمت کم رکھنا چاہیے تھا تاکہ شائقین زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں، ساہتیہ اکیڈمی ترجمان القرآن کی اشاعت پر قابل مبارکباد ہے کہ اس نے اردو زبان کے اس خالص اسلامی لٹریچر کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔

انوار بردہ - از پروفیسر فضل عارف صاحب، صفحات ۲۸۸، کتابت و طباعت متوسط، ناشر علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور، قیمت ۳ے

نعت نبوی ایک مستقل صنف شاعری ہے، اس کی ابتدا قرآن کے نزول کے ساتھ ہی ہوئی، اس صنف میں عہد نبوی سے اب تک عربی، فارسی، اردو اور دوسری زبانوں میں بیشمار نعتیہ قصیدے اور نعتیہ غزلیں لکھی گئی ہیں، عربی زبان میں جن نعتیہ قصائد کو شہرت دوام حاصل ہوئی ان میں کعب بن زہیرؓ اور بوصیریؒ کے قصیدے سر فہرست ہیں، خاص طور سے بوصیری کا قصیدہ میمیہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کاغذ کی سیاہی سے نہیں بلکہ خون دل سے لکھا گیا ہے کہ سات صدی گذرنے کے بعد بھی اس کا درد و سوز اور اس کی کشش اور تاثیر کم نہیں ہوئی ہے، سوز دروں کے ساتھ اس میں زبان کی جو سلاست، بیان کی حلاوت اور ترکیب، محاورہ کی رعایت ہے وہ کم قصیدوں کو نصیب ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ قصیدہ ہمارے نصاب تعلیم کا ہمیشہ

جزرہا ہے، اس کی عربی، فارسی اور اردو میں بکثرت شرحیں لکھی گئیں، پروفیسر فضل عارف صاحب جو اس سے پہلے فلسفۂ دعا اور استخارہ، حکمت حبیبی کتابیں لکھکر اہل علم اور اہل دل سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں، بوصیری کی اس داستانِ عشق نبوی ؐ کی شرح لکھکر انھوں نے اپنے عشقِ دروں کا ایک مزید ثبوت فراہم کیا ہے۔

تجلیات کعبہ و تجلیات مدینہ - از مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی، صفحات ۳۱۵ و ۲۵۴، کتابت و طباعت بہتر، ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی، ہر ایک کی قیمت ؏

مولانا احتشام الحسن صاحب متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جو تبلیغی حلقوں میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں، مولانا چونکہ بہت سے بزرگوں، خاص طور پر مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی صحبت اٹھائے ہوئے ہیں، اس لیے ان کی تحریروں میں ایک خاص طرح کی کیفیت و تاثیر ہوتی ہے، یہ دونوں کتابیں ان کی اس کیفیت باطنی کا مظہر ہیں، پہلی کتاب میں انھوں نے کعبہ مکرمہ کے آداب، اس کے فضائل اور حج کے ارکان وغیرہ کی بڑی والہانہ انداز میں تفصیل کی ہے، اور دوسری کتاب میں حرم نبوی کے آداب و کوائف کا بڑے پُرسوز انداز میں ذکر کیا ہے، یہ دونوں کتابیں عام مسلمانوں اور خاص طور پر حاجیوں کے مطالعہ کے لائق ہیں۔

اخلاق محسنی (اردو ترجمہ) - از ملا حسین واعظ کاشفی، ترجمہ قاضی سجاد حسین صاحب، صفحات ۳۰۴، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر سب رنگ کتاب گھر، دہلی، قیمت للعہ

نصف صدی پہلے تک اخلاقی و مذہبی کتابوں کو ہمارے نصاب تعلیم میں بنیادی حیثیت حاصل تھی اور انھیں ہندو مسلمان سب پڑھتے تھے، مگر رفتہ رفتہ اب یہ کتابیں نصاب سے خارج ہوتی جا رہی ہیں، جس کی وجہ سے ہماری نوجوان نسل میں اخلاقی قدریں کم سے کم ہوتی جا رہی ہیں، انھی کتابوں میں ملا حسین واعظ کاشفی متوفی سنہ ۹۱۰ھ کی فارسی کتاب اخلاق محسنی بھی ہے،

جو برسوں نصابِ تعلیم کا جز رہی ہے، فارسی کا مذاق اب بالکل باقی نہیں رہا، اس لیے اس کے اردو ترجمہ کی ضرورت تھی، اس ضرورت کو مولانا قاضی سجاد حسین صاحب نے پورا کر دیا ہے، اس سے پہلے قاضی صاحب گلستان، بوستان اور دیوان حافظ وغیرہ کا ترجمہ بھی کر چکے ہیں، ترجمہ نہایت سلیس اور معنی خیز ہے۔

چند ادبی مسائل - از پروفیسر شاہ مقبول احمد صاحب، صفحات ۱۷۵، کتابت و طباعت معمولی، ناشر مکتبہ صنم، سبزی باغ، پٹنہ ۴، ؏

پروفیسر شاہ مقبول احمد صاحب اردو ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، ان کو زندگی کے نشیب و فراز سے بھی سابقہ رہا ہے، اس لیے ان کی تحریروں میں واقعیت ہوتی ہے، وہ آغاز جوانی یعنی سنہ ۱۹۴۰ء سے سنہ ۱۹۶۰ء تک برابر ادبی و لسانی موضوعات پر مضامین لکھتے رہے، جن میں کئی مضمون اردو کے مشہور رسالوں مثلاً اردو سہ ماہی وغیرہ میں بھی شائع ہو چکے ہیں، اب ان ہی مضامین کو "چند ادبی مسائل" نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، اس مجموعے میں کل ۱۳ مضامین ہیں اور تقریباً ہر مضمون دلچسپ اور پُرمعلومات ہے، خاص طور پر اردو یا ہندوستانی، اردو ہندی اور بہار کے دیہاتی محاورے وغیرہ ان کے بہترین مضمون شمار کیے جا سکتے ہیں، امید ہے کہ یہ مجموعہ عام اور باذوق اور خاص طور پر بہار کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خاصا مقبول ہوگا۔

حکیم الاوقات - از مولوی عبد الحکیم صاحب ایم اے سی سی، صفحات ۱۶، کتابت و طباعت عمدہ، پتہ فہیم الدین انصاری، قصبہ سرائے میر، اعظم گڈھ، قیمت ۴ر

جناب مولانا عبد الحکیم صاحب لکچرر شعبۂ تعلیمات، شبلی کالج کو علم ہیئت سے فطری مناسبت ہے، انھوں نے قدیم و جدید دونوں ہیئتوں کا مطالعہ کیا ہے، ہندوستان کی رصدگاہوں سے ان کی خط و کتابت بھی رہی ہے، اس موضوع پر وہ علمی و عملی کام بھی کرتے رہے ہیں، انھوں نے اس کتاب میں

اوقات طلوع وغروب اور صبح صادق اور نصف النہار کی پوری تفصیل بڑی تحقیق سے کی ہے،
انھوں نے شروع میں دو تین صفحے کا جو مختصر دیباچہ لکھا ہے وہ بہت ہی عمدہ اور مؤثر ہے، اس کے
پڑھنے سے وقت کی قدر وقیمت دل میں پیوست ہو جاتی ہے، نمازیوں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔

اوراقِ مصوّر۔ از سکندر علی وجد، صفحات ۲۰۸، ٹائپ اعلیٰ، کاغذ عمدہ، مع گردپوش
ناشر مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، قیمت : معہ

سکندر علی وجد اس دور کے نامور شعراء میں ہیں، اس سے پہلے ان کے کلام کے دو مجموعے شائع
ہو چکے ہیں، یہ تیسرا مجموعہ ہے، اس مجموعے کی ترتیب اصناف شاعری کے اعتبار سے نہیں بلکہ مسلسل
ہے، یعنی ایک غزل پھر اس کے مقابلہ میں ایک نظم، اس طرح پورا مجموعہ غزلوں اور نظموں کا مرقع بن گیا
ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ "شاعری میں نئے تجربے کرنے کی مجھے فرصت نہیں ملی"، غالباً یہ عدیم الفرصتی
ہی ان کی شاعری کا حسن ہے، انھوں نے جدت و ترقی پسندی کی سب وادیوں کی سیر کی ہے،
مگر صرف اس کی خوبیوں کو لیا ہے، اور اس کے نقائص وعیوب سے بڑی حد تک اپنی شاعری کو محفوظ
رکھنے کی کوشش کی ہے، اس لیے ان کا کلام اردو شاعری کی ادبی روایات کے اعتبار سے
بھی بلند پایہ ہے، ان کو نظم وغزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے، اور ان کے
کلام میں دونوں کے بہترین نمونے ملتے ہیں، خاص طور پر ان کی بعض نظمیں مثلاً اجنتا،
الیورا، اورنگ آباد، جگنو، وغیرہ تو شاہکار ہیں، اردو دواوین کے ذخیرہ میں اس
سے ایک عمدہ اضافہ ہوا ہے۔

"م - ج"

جلد ۹۶ - ماہ رجب المرجب ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۶۵ء - عدد ۵

مضامین

مقالات

ادبیات